

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ

یہ مکی سورت ہر جس میں سات آیتیں ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سورة فاتحہ کے فضائل | سورة فاتحہ کو قرآن کریم میں بہت سی خصوصیات حاصل ہیں، اول یہ کہ قرآن اور خصوصیات اسی سے شروع ہوتا ہے، نماز اسی سے شروع ہوتی ہے، اور نزول کے اعتبار سے بھی سب سے پہلی سورت جو مکمل طور پر نازل ہوئی یہی سورت ہی سورة اقصا، مزمل اور مدثر کی چند آیات ضرور اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں مگر مکمل سورت سب سے پہلے فاتحہ ہی نازل ہوئی ہے، جن حضرات صحابہ سے سورة فاتحہ کا اول مانزل یعنی نزول میں سب سے پہلی سورة ہونا منقول ہے، اُن کا مطلب غالباً یہی ہے کہ پوری سورت اس سے پہلے اور کوئی نازل نہیں ہوئی، شاید اسی وجہ سے اس سورت کا نام بھی فاتحہ الکتاب رکھا گیا ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ سورت ایک حیثیت سے پورے قرآن کا متن اور سارا قرآن اس کی شرح ہے، خواہ اس وجہ سے کہ پورے قرآن کے مقاصد ایمان اور عمل صالح میں دائر ہیں، اور ان دونوں چیزوں کے بنیادی اصول اس سورت میں بیان کر دیئے گئے ہیں، تفسیر روح المعانی اور روح البیان میں اس کا تفصیلی بیان ہے، اسی وجہ سے سورة فاتحہ کے نام ام القرآن، ام الکتاب اور قرآن عظیم بھی، انا دیث صحیحہ میں آئے ہیں۔ (قرطبی)

یا اس وجہ سے کہ اس سورت میں اس شخص کے لئے جو قرآن کی تلاوت یا مطالعہ شروع کرے ایک خاص ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اس کتاب کو اپنے تمام پچھلے خیالات اور نظریات سے خالی الذہن ہو کر

خاص طلب حق اور راہ راست کی جستجو کے لئے پڑھے اور دیکھے، اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی کرے کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا ہو، اور شروع سورت میں اُس ذات کی حمد و ثناء کا بیان ہے جس کی بارگاہ میں یہ درخواست ہدایت پیش کرتا ہے، اور اسی درخواست کا جواب پورا قرآن ہے، جو اَلَمْ ذَلِك الْكِتَاب سے شروع ہوتا ہے، گویا انسان نے جو اللہ تعالیٰ سے راہ راست طلب کی تھی اس کے جواب میں ذلک الْكِتَاب منبرا کر اشارہ کر دیا گیا کہ جو تم مانگتے ہو وہ اس کتاب میں موجود ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ سورۃ فاتحہ کی نظیر نہ تو رآت میں نازل ہوئی نہ انجیل اور زبور میں اور نہ خود قرآن کریم میں کوئی دوسری سورت اس کی مثل ہے (رواہ الترمذی عن ابی ہریرۃؓ وقال حسن صحیح والحاکم وقال صحیح علی شرط مسلم، منظرہری) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۃ فاتحہ ہر بیماری کی شفا ہے (رواہ البیہقی فی شعب الایمان بسند صحیح، منظرہری)

سورۃ فاتحہ کا ایک نام حدیث میں سورۃ شفاء بھی آیا ہے (قرطبی) اور صحیح بخاری میں بروایت انسؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کریم کی سب سورتوں میں عظیم ترین الحمد للہ رب العالمین ہے۔ (قرطبی)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

بسم اللہ قرآن کی ایک آیت ہے اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ سوائے سورۃ توبہ کے ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ لکھی جاتی ہے، اس میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے کہ بسم اللہ سورۃ فاتحہ کا یا تمام سورتوں کا جزو ہی یا نہیں؟ امام عظیم ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ بسم اللہ سورت کا جزو نہیں، بلکہ ایک مستقل آیت ہے، جو ہر سورۃ کے شروع میں دوسورتوں کے درمیان فصل اور امتیاز ظاہر کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔

تلاوت قرآن اور ہر مہم کام کو اہل جاہلیت کی عادت تھی کہ اپنے کاموں کو بتوں کے نام سے شروع کیا کرتے تھے، بسم اللہ سے شروع کرنے کا حکم اس رسم جاہلیت کو مٹانے کے لئے قرآن کی سب سے پہلی آیت جو جبریل امینؑ لے کر آئے اس میں قرآن کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کا حکم دیا گیا، اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ ۝

علامہ سیوطیؒ نے فرمایا کہ قرآن کے سوا دوسری تمام آسمانی کتابیں بھی بسم اللہ سے شروع کی گئی ہیں

اور بعض علماء نے فرمایا ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قرآن اور اُمّتِ محمدیہ کی خصوصیت میں سے ہے، دونوں قول کی تطبیق یہ ہے کہ اللہ کے نام سے شروع کرنا تو تمام آسمانی کتابوں میں مشترک ہے، مگر الفاظ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قرآن کی خصوصیت ہے، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ابتداء میں ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کے لئے بِاسْمِکَ اللّٰہُمَّ کہتے اور لکھتے تھے، جب آیت بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نازل ہوئی تو انھیں الفاظ کو اختیار فرمایا، اور ہمیشہ کے لئے یہ سنت جاری ہو گئی (قرطبی روح المعانی) قرآن کریم میں جا بجا اس کی ہدایت ہے کہ ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کیا جائے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مہم کام جو بِسْمِ اللّٰهِ سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت رہتا ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ گھر کا دروازہ بند کر دو تو بِسْمِ اللّٰهِ کہو، چراغ گل کر دو تو بِسْمِ اللّٰهِ کہو، برتن ڈھکو تو بِسْمِ اللّٰهِ کہو، کھانا کھانے، پانی پینے، وضو کرنے، سواری پر سوار ہونے اور اترنے کے وقت بِسْمِ اللّٰهِ پڑھنے کی ہدایات قرآن و حدیث میں بار بار آئی ہیں (قرطبی)

ہر کام کو بسم اللہ سے | اسلام نے ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کی ہدایت دے کر انسان کی پوری شروعات کرنے کی حکمت | زندگی کا رُخ اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح پھیر دیا ہے کہ وہ قدم قدم پر اس حلف

و فاداری کی تجدید کرتا ہے کہ میرا وجود اور میرا کوئی کام بغیر اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادے اور اس کی امداد کے نہیں ہو سکتا جس نے اس کی ہر نقل و حرکت اور تمام معاشی اور دنیوی کاموں کو بھی ایک عبادت بنا دیا۔ عمل کتنا مختصر ہے کہ نہ اس میں کوئی وقت خرچ ہوتا ہے نہ محنت، اور فائدہ کتنا کیمیادی اور بڑا ہے

کہ دنیا بھی دین بن گئی، ایک کافر بھی کھاتا پیتا ہے اور ایک مسلمان بھی، مگر مسلمان اپنے لقمے سے پہلے بسم اللہ کہہ کر یہ اقرار کرتا ہے کہ یہ لقمہ زمین سے پیدا ہونے سے لیکر تک کر تیار ہونے تک آسمان زمین اور سیاروں اور ہوا و فضائی مخلوقات کی طاقتیں، پھر لاکھوں انسانوں کی محنت صرف ہو کر تیار ہوا ہے، اس کا حاصل کرنا میرے بس میں نہ تھا، اللہ ہی کی ذات ہے جس نے ان تمام مراحل سے گزار کر یہ لقمہ

یا گھونٹ مجھے عطا فرمایا ہے، مومن و کافر دونوں سوتے جاگتے بھی ہیں، چلتے پھرتے بھی ہیں، مگر ہر مومن سونے سے پہلے اور بیدار ہونے کے وقت اللہ کا نام لے کر اللہ کے ساتھ اسی طرح اپنے رابطے کی تجدید کرتا ہے جس سے یہ تمام دنیاوی اور معاشی ضرورتیں ذکر خدا بنکر عبادت میں لکھی جاتی ہیں، مومن سواری پر سوار

ہوتے ہوئے بسم اللہ کہہ کر گویا یہ شہادت دیتا ہے کہ اس سواری کا پیدا کرنا یا مہیا کرنا، پھر اس کو میرے قبضے میں دیدینا انسان کی قدرت سے باہر چیز ہے، رب العزت ہی کے بنائے ہوئے نظامِ محکم کا کام ہے کہ کہیں کی لکڑی، کہیں کا لوہا، کہیں کی مختلف دھاتیں، کہیں کے کاریگر، کہیں کے چلانے والے سب کے سب

میری خدمت میں لگے ہوئے ہیں، چند پیسے خرچ کرنے سے اتنی بڑی خلق خدا کی محنت کو ہم اپنے کام میں لا سکتے ہیں، اور وہ پیسے بھی ہم اپنے ساتھ کہیں سے نہیں لائے تھے، بلکہ اس کے حاصل کرنے کے تمام اسباب بھی اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں، غور کیجئے کہ اسلام کی صرف اسی ایک ہی مختصر سی تعلیم نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ ایک نسخہ اکسیر ہے جس سے تائب کا نہیں بلکہ خاک کا سونا بنتا ہے، فَلَلهِ الْحَمْدُ عَلَى دِينِ الْإِسْلَامِ وَتَعْلِيمَاتِهِ۔

مسئلہ قرآن کی تلاوت شروع کرنے کے وقت اول اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ اور پھر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھنا سنت ہے، اور درمیان تلاوت بھی سورہ براءت کے علاوہ ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا سنت ہے۔

اس تمہید کے بعد آیت بسم اللہ الرحمن الرحیم کی تفسیر دیکھئے:

بسم اللہ کی تفسیر | بِسْمِ اللّٰهِ، یہ کلمہ تین لفظوں سے مرکب ہے، ایک حرف بار، دوسرے اِسْم، تیسرے اللہ، حرف بار عربی زبان میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتی ہے،

جن میں سے تین معنی مناسب مقام ہیں، ان میں سے ہر ایک معنی اس جگہ لئے جاسکتے ہیں:

اول: مصاحبت، یعنی کسی چیز کا کسی چیز سے متصل ہونا، دوسرے: استعانت، یعنی کسی چیز سے مدد حاصل کرنا، تیسرے: تبرک، یعنی کسی چیز سے برکت حاصل کرنا۔

لفظ اِسْم میں لغوی اور علمی تفصیلات بہت ہیں، جن کا جاننا عوام کے لئے ضروری نہیں، اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اردو میں اس کا ترجمہ نام سے کیا جاتا ہے۔

لفظ اللہ، اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ جامع نام ہے، اور بعض علماء نے اسی کو اسم اعظم کہا ہے، اور یہ نام اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا، اس لئے اس لفظ کا تثنیہ اور جمع نہیں آتے، کیونکہ اللہ واحد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نام ہے اس موجود حق کا جو تمام صفات کمال کا جامع اور صفات ربوبیت کے ساتھ متصف، یکتا اور بے مثال ہے۔

اس لئے کلمہ بسم اللہ کے معنی حرف بار کے مذکورہ تین معنی کی ترتیب سے یہ ہوئے:

اللہ کے نام کے ساتھ، اللہ کے نام کی مدد سے، اللہ کے نام کی برکت سے،

لیکن تینوں صورتوں میں یہ ظاہر ہے کہ یہ کلام نامکمل ہے، جب تک اس کام کا ذکر نہ کیا جائے جو اللہ کے نام کے ساتھ یا اس کے نام کی برکت سے کرنا مقصود ہے، اس لئے نحوی قاعدے کے مطابق یہاں کوئی فعل مناسب مقام محذوف ہوتا ہے، مثلاً شروع کرتا ہوں یا پڑھتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ۔

اور مناسب یہ ہے کہ یہ فعل بھی بعد میں محذوف مانا جائے، تاکہ حقیقتاً شروع اسم اللہ ہی سے

ہو، وہ فعل محذوف بھی اسم اللہ سے پہلے نہ آئے، صرف حرف بار کا اسم اللہ سے پہلے آنا عربی زبان

کے لحاظ سے ضروری و ناگزیر ہے، اس میں بھی مصحف عثمانی میں باجماع صحابہؓ یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ حرف بار رسم الخط کے قاعدے سے الف کے ساتھ ملا کر لکھنا چاہئے تھا، اور لفظ اسم الگ، جس کی صورت ہوتی باسْمِ اللہ، لیکن مصحف عثمانی کے رسم الخط میں حرف ہمزہ کو حذف کر کے حرف بار کو سین کے ساتھ ملا کر صورتہ اسم کا حُبُز بنادیا، تاکہ شروع اسم اللہ سے ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ دوسرے مواقع میں یہ حرف الف حذف نہیں کیا جاتا، جیسے اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں تَب کو الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے، یہ صرف بسم اللہ کی خصوصیت ہے کہ حرف بار کو سین کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، رَحْمٰن کے معنی عام الرحمة کے اور رَحِیْم کے معنی تام الرحمة کے ہیں، عام الرحمة سے مطلب یہ ہے کہ وہ ذات جس کی رحمت سارے عالم اور ساری کائنات اور جو کچھ اب تک پیدا ہوا ہے اور جو کچھ ہوگا سب پر حاوی اور شامل ہو، اور تام الرحمة کا مطلب یہ ہے کہ اس کی رحمت کامل و مکمل ہو۔

یہی وجہ ہے کہ لفظ رَحْمٰن اللہ جل شانہ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، کسی مخلوق کو رَحْمٰن کہنا جائز نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں ہو سکتا جس کی رحمت عالم کی کوئی چیز خالی نہ رہے، اسی لئے جس طرح لفظ اللہ کا جمع اور تشبیہ نہیں آتا رَحْمٰن کا بھی جمع و تشبیہ نہیں آتا، کیونکہ وہ ایک ہی ذات پاک کے ساتھ مخصوص ہے، دوسرے اور تیسرے کا وہاں احتمال ہی نہیں، (تفسیر قرطبی) بخلاف لفظ رَحِیْم کے کہ اس کے معنی میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کا پایا جانا مخلوق میں ناممکن ہو، کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی شخص سے پوری پوری رحمت کا معاملہ کرے۔

اسی لئے لفظ رَحِیْم انسان کیلئے بھی بولا جاسکتا ہے، قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی یہ لفظ استعمال فرمایا ہے، بِالنُّمُوِّ مِّنْ رَّوْحٍ رَّحِیْمٍ۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آجکل عبد الرحمن، فضل الرحمن وغیرہ ناموں میں تخفیف مسئلہ کر کے رَحْمٰن کہتے ہیں، اور اس شخص کو اس لفظ سے خطاب کرتے ہیں یہ ناجائز و گناہ ہے۔

بسم اللہ میں اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ اور صفات کمال میں سے صرف دو صفتیں حِکْمَت ذکر کی گئی ہیں، اور وہ دونوں لفظ رحمت سے مشتق ہیں، اور وسعت رحمت اور کمال رحمت پر دلالت کرنے والی ہیں، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تخلیق عالم اور آسمان و زمین اور تمام کائنات کے پیدا کرنے اور ان کو پالنے وغیرہ کا منشاء اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت ہے، نہ اس کو ان چیزوں کی خود کوئی ضرورت تھی نہ کوئی دوسرا ان چیزوں کے پیدا کرنے پر مجبور کر نیوالا تھا صرف اسی کی رحمت کے تقاضے سے یہ ساری چیزیں اور ان کی پرورش کے سارے انتظامات وجود میں آئے ہیں۔

ما نبودیم و تقاضا ما نبود لطف تو ناگفتہ مامی شنود

احکام و مسائل

مسئلہ تعوذ | تعوذ کے معنی ہیں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ پڑھنا، قرآن کریم میں ارشاد ہے فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ یعنی جب تم قرآن کی تلاوت کرو تو اللہ سے پناہ مانگو شیطان دُکھ سے۔ قرأت قرآن سے پہلے تعوذ پڑھنا باجماع امت سنت ہے، خواہ تلاوت نماز کے اندر ہو یا خارج نماز (شرح منیہ) تعوذ پڑھنا تلاوت قرآن کے ساتھ مخصوص ہے، علاوہ تلاوت کے دوسرے کاموں کے شروع میں صرف بسم اللہ پڑھی جائے، تعوذ مسنون نہیں، (عالمگیری، باب رابع، من الکراہیۃ)

جب قرآن شریف کی تلاوت کی جائے اس وقت اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اور بِسْمِ اللّٰهِ دونوں پڑھی جائیں درمیان تلاوت میں جب ایک سورت ختم ہو کر دوسری شروع ہو تو سورہ برات کے علاوہ ہر سورت کے شروع میں مکرر بسم اللہ پڑھی جائے، اَعُوْذُ بِاللّٰهِ نہیں، اور سورہ برات اگر درمیان تلاوت میں آجائے تو اس پر بسم اللہ نہ پڑھے، اور اگر قرآن کی تلاوت سورہ برات ہی سے شروع کر رہا ہے تو اس کے شروع میں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اور بسم اللہ پڑھنا چاہئے (عالمگیری عن المحیط)

احکام بسم اللہ | بسم اللہ الرحمن الرحیم قرآن مجید میں سورہ نمل میں آیت کا جزرہ ہے، اور ہر دو سورتوں کے درمیان مستقل آیت ہے، اس لئے اس کا احترام قرآن مجید ہی کی طرح واجب ہے، اس کو بے وضو ہاتھ لگانا جائز نہیں (علی مختار الکرخی و صاحب الکافی والہدایہ، شرح منیہ) اور جنابت یا حیض و نفاس کی حالت میں اس کو بطور تلاوت پڑھنا بھی پاک ہونے سے پہلے جائز نہیں، ہاں کسی کام کے شروع میں، جیسے کھانے پینے سے پہلے بطور دعا پڑھنا ہر حال میں جائز ہے (شرح منیہ کبیر)

مسئلہ | پہلی رکعت کے شروع میں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ کے بعد بسم اللہ پڑھنا مسنون ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آواز سے پڑھا جائے یا آہستہ، امام اعظم ابو حنیفہ اور بہت سے دوسرے ائمہ آہستہ پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ پہلی رکعت کے بعد دوسری رکعتوں کے شروع میں بھی بسم اللہ پڑھنا چاہئے، اس کے مسنون ہونے پر سب کا اتفاق ہے، اور بعض روایات میں ہر رکعت کے شروع میں بسم اللہ پڑھنے کو واجب کہا گیا ہے (شرح منیہ)

مسئلہ | نماز میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ نہیں پڑھنا چاہئے، خواہ چہری نماز یا ستری، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین سے ثابت نہیں ہے، شرح منیہ میں اسی کو امام اعظم اور ابو یوسف کا قول لکھا ہے اور شرح منیہ، در مختار، برہان وغیرہ میں اسی کو ترجیح دی ہے، مگر امام محمد کا قول یہ ہے کہ ستری نمازوں میں پڑھنا بہتر ہے، بعض روایات میں یہ قول ابو حنیفہ کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے، اور شامی نے بعض فقہاء سے اس کی ترجیح بھی نقل کی ہے، بہشتی زیور میں بھی اسی کو اختیار کیا گیا ہے، اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ کوئی پڑھ لے تو مکروہ نہیں (شامی)

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ

اَيَاتُهَا سَبْعٌ	سُورَةُ الْفَاتِحَةِ بِسْمِ اللَّهِ	وَرُكُوعُهَا وَاحِدٌ
اس میں سات آیتیں ہیں	سورۃ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی	اور ایک رکوع
	بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	
	شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔	
الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۱	الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۲	مَلِكِ
سب تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جو پالنے والا سارے جہان کا، بے حد مہربان نہایت رحم والا، مالک		
يَوْمِ الدِّينِ ۳	إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۴	إِهْدِنَا الصِّرَاطَ
روزِ جزا کا، تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں، بتلا ہم کو راہ		
الْمُسْتَقِيمَ ۵	صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۶	غَيْرِ الْمَغْضُوبِ
سیدھی، راہ اُن لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا جن پر نہ تیرا غصہ ہوا		
	عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۷	
	اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔	

خلاصہ تفسیر

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں اَلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ
 الْعَالَمِينَ (سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مہربان ہیں ہر عالم کے (مخلوقات الگ الگ جنس
 ایک ایک عالم کہلاتا ہے، مثلاً عالم ملائکہ، عالم انسان، عالم جن، الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ جو بڑے
 مہربان نہایت رحم والے ہیں مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ جو مالک ہیں روزِ جزا کے (مراد قیامت کا دن ہے)
 جس میں ہر شخص اپنے عمل کا بدلہ پاوے گا، إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ہم آپ ہی کی عبادت

کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں، اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ بتلادیکر ہم کو راستہ سیدھا (مراد دین کا راستہ ہے) صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا (مراد دین کا انعام ہے) غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ نہ راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب ہوا، اور نہ ان لوگوں کا جو راستہ سے گم ہو گئے (راہ ہدایت چھوٹنے کی دوجہ ہوا کرتی ہیں، ایک تو یہ کہ اس کی پوری تحقیق ہی نہ کرے، ضالین سے ایسے لوگ مراد ہیں، دوسری وجہ یہ ہے کہ تحقیق پوری ہونے کے باوجود اس پر عمل نہ کرے، مغضوب علیہم سے ایسے لوگ مراد ہیں، کیونکہ جان بوجھ کر خلافت کرنا زیادہ ناراضی کا سبب ہوتا ہے)۔

معارف مسائل

سورۃ فاتحہ کے مضامین | سورۃ فاتحہ سات آیتوں پر مشتمل ہے، جن میں سے پہلی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء ہے، اور آخری تین آیتوں میں انسان کی طرف سے دعاء و درخواست کا مضمون ہے، جو رب العزت نے اپنی رحمت سے خود ہی انسان کو سکھایا ہے، اور درمیانی ایک آیت میں دونوں چیزیں مشترک ہیں، کچھ حمد و ثناء کا پہلو ہے کچھ دعاء و درخواست کا۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ منقول ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نماز (یعنی سورۃ فاتحہ) میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے، نصف میرے لئے ہے اور نصف میرے بندے کے لئے، اور کچھ میرا بندہ مانگتا ہے وہ اس کو دیا جائیگا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ جب کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”میرے بندے نے میری حمد کی ہے“، اور جب وہ کہتا ہے الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”میرے بندے نے میری تعریف و ثناء بیان کی ہے“، اور جب بندہ کہتا ہے مَلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی ہے“، اور جب بندہ کہتا ہے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے“، کیونکہ اس میں ایک پہلو حق تعالیٰ کی حمد و ثناء کا ہے اور دوسرا پہلو بندے کی دعاء و درخواست کا، اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ: ”میرے بندے کو وہ چیز ملے گی جو اس نے مانگی“ پھر جب بندہ کہتا ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (آخر تک) تو حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”یہ سب میرے بندے کے لئے ہے“ اور اس کو وہ چیز ملے گی جو اس نے مانگی (منظہری)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے معنی یہ ہیں کہ سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں، یعنی دنیا میں جہاں کہیں کسی چیز کی تعریف کی جاتی ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی تعریف ہے، کیونکہ اس جہاں رنگ و بو میں جہاں

ہزاروں حسین مناظر اور لاکھوں دلکش نظارے اور کروڑوں نفع بخش چیزیں انسان کے دامن دل کو ہر وقت اپنی طرف کھینچتی رہتی ہیں اور اپنی تعریف پر مجبور کرتی ہیں، اگر ذرا نظر کو گہرا کیا جائے تو ان سب چیزوں کے پردے میں ایک ہی دست قدرت کا فرمانظر آتا ہے، اور دنیا میں جہاں کہیں کسی چیز کی تعریف کی جاتی ہے اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں جیسے کسی نقش و نگار یا تصویر کی یا کسی صنعت کی تعریف کی جائے کہ یہ سب تعریفیں درحقیقت نقاش اور مصور کی یا صنّاع کی ہوتی ہیں، اس جملے نے کثرتوں کے تلاطم میں پھنسے ہوئے انسان کے سامنے ایک حقیقت کا دروازہ کھول کر یہ دکھلا دیا کہ یہ ساری کثرتیں ایک ہی وحدت سے مربوط ہیں، اور ساری تعریفیں درحقیقت اسی ایک قادر مطلق کی ہیں ان کی کسی دوسری تعریف سمجھنا نظر و بصیرت کی کوتاہی ہے ۷

حمد را با تو نسبت است درست

بر در ہر کہ رفت بر در تست

اور یہ ظاہر ہے کہ جب ساری کائنات میں لائقِ حمد درحقیقت ایک ہی ذات ہو تو عبادت کی مستحق بھی وہی ذات ہو سکتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ اگرچہ حمد و ثناء کے لئے لایا گیا ہے، لیکن اس ضمن میں ایک معجزانہ انداز سے مخلوق پرستی کی بنیاد ختم کر دی گئی، اور دل نشین طریق پر توحید کی تعلیم دی گئی ہے۔

غور کیجئے کہ قرآن کے اس مختصر سے ابتدائی جملے میں ایک طرف تو حق تعالیٰ کی حمد و ثناء کا بیان ہوا، اسی کے ساتھ مخلوقات کی رنگینیوں میں اُلجھے ہوئے دل و دماغ کو ایک حقیقت کی طرف متوجہ کر کے مخلوق پرستی کی جڑ کاٹ دی گئی، اور معجزانہ انداز سے ایمان کے سب پہلے رکن توحید باری کا نقش اس طرح جما دیا گیا کہ جو دعویٰ ہو اسی میں غور کرو تو وہی اپنی دلیل بھی ہے، فَتَبَارَكَ اللهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ،

رَبِّ الْعَالَمِينَ کی تفسیر | اس مختصر ابتدائی جملے کے بعد اللہ تعالیٰ کی پہلی صفت رَبِّ الْعَالَمِينَ ذکر کی گئی ہے، مختصر الفاظ میں اس کی بھی تشریح دیکھئے:-

لفظ رَبِّ کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے تربیت و پرورش کرنے والے کے ہیں، اور تربیت اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو اس کے تمام مصالح کی رعایت کرتے ہوئے درجہ بدرجہ آگے بڑھایا جائے یہاں تک، کہ وہ حدِ کمال کو پہنچ جائے۔

یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے لئے مخصوص ہے، کسی مخلوق کو بدون اضافت کے رب کہنا جائز نہیں، کیونکہ ہر مخلوق خود محتاج تربیت ہو وہ کسی دوسرے کی کیا تربیت کر سکتا ہے۔

الْعَالَمِينَ عالم کی جمع ہے، جس میں دنیا کی تمام اجناس : آسمان، چاند، سورج اور تمام ستارے اور ہوا و فضا، برق و باران، فرشتے، جنات، زمین اور اس کی تمام مخلوقات، حیوانات، انسان

نباتات، جمادات سب ہی داخل ہیں، اس لئے رَبِّ الْعَالَمِينَ کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ تمام اجناس کائنات کی تربیت کرنے والے ہیں، اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ جیسا یہ ایک عالم ہے جس میں ہم جیتے ہیں اور اس کے نظام شمسی و قمری اور برق و باران اور زمین کی لاکھوں مخلوقات کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں یہ سارا ایک ہی عالم ہو، اور اسی جیسے اور ہزاروں لاکھوں دوسرے عالم ہوں جو اس عالم سے باہر کی خلا میں موجود ہوں، امام رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں فرمایا ہے کہ اس عالم سے باہر ایک لامتناہی خلا کا وجود دلائل عقلیہ سے ثابت ہے، اور یہ بھی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت ہے، اُس کے لئے کیا مشکل ہے کہ اُس نے اس لامتناہی خلا میں ہمارے پیشِ نظر عالم کی طرح کے اور بھی ہزاروں لاکھوں عالم بنا رکھے ہوں۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے منقول ہے کہ ”عالم چالیس ہزار ہیں، یہ دنیا مشرق سے مغرب تک ایک عالم ہے، باقی اس کے ہوا ہیں“ اسی طرح حضرت مقاتلؒ امام تفسیر سے منقول ہے کہ ”عالم اسی ہزار ہیں“ (قرطبی) اس پر جو یہ شبہ کیا جاتا تھا کہ خلا میں انسانی مزاج کے مناسب ہوا نہیں ہوتی، اس لئے انسان یا کوئی حیوان وہاں زندہ نہیں رہ سکتا، امام رازیؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ کیا ضروری ہے کہ اس عالم سے خارج خلا میں جو دوسرے عالم کے باشندے ہوں اُن کا مزاج بھی ہمارے عالم کے باشندوں کی طرح ہو جو خلا میں زندہ نہ رہ سکیں، یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ اُن عالموں کے باشندوں کے مزاج و طبائع، ان کی غذا و ہوا یہاں کے باشندوں سے بالکل مختلف ہوں۔

یہ مضمون تو اب سے سات سو ستتر سال پہلے کے اسلامی فلاسفہ امام رازیؒ کا لکھا ہوا ہے، جبکہ فضاء و خلا کی سیر اور اس کی پیمائش کے آلات و ذرائع ایجاد نہ ہوئے تھے، آج راکٹوں اور اسپٹنکوں کے زمانے میں خلا کے مسافروں نے جو کچھ آکر بتلایا وہ بھی اس سے زیادہ نہیں، کہ اس عالم سے باہر کی خلا کی کوئی حد نہایت نہیں ہے، اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس غیر متناہی خلا میں کیا کچھ موجود ہے، اس دنیا سے قریب ترین سیاروں، چاند، اور مریخ کی آبادی کے بارے میں جو قیاسات آج کے جدید ترین ماہرین سائنس پیش کر رہے ہیں وہ بھی یہی ہیں کہ اگر ان سیارات کے اوپر کچھ لوگ آباد ہیں تو یہ ضروری نہیں کہ وہ انہیں خصوصیات اور اسی مزاج و طبیعت کے ہوں جو اس عالم کے انسان اور حیوانات و نباتات کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں، بلکہ متین قیاس یہ ہے کہ اُن کے مزاج و طبیعت، ان کی غذا و ضروریات یہاں کے لوگوں سے بالکل مختلف ہوں، اس لئے ایک کو دوسرے پر قیاس کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

امام رازیؒ کی تائید اور اس سلسلے کی جدید معلومات کے لئے وہ مقالہ کافی ہے جو امریکی خلائی مسافر جان گلین نے حال میں خلا کے ”سفر واپس آکر شائع کرایا ہے، جس میں شعاعی سال کا نام دے کر ایک طویل مدت و مسافت کا پیمانہ قائم کیا، اور اس کے ذریعے اپنی وسعت فکر کی حد تک خلا کا کچھ اندازہ لگایا

اور پھر یہ استرا کیا کہ کچھ نہیں بتلایا جاسکتا کہ خلل کی وسعت کتنی اور کہاں تک ہے۔
 قرآن کے اس مختصر جملے کے ساتھ اب تمام عالم اور اس کی کائنات پر نظر ڈالئے، اور چشم بصیرت دیکھئے کہ حق تعالیٰ نے تربیت عالم کا کیسا مضبوط اور محکم مجیر العقول نظام بنایا ہے، افلاک کے لے کر عناصر تک، سیارات و نجوم سے لے کر ذرات تک ہر چیز اس سلسلہ نظام میں بندھی ہوئی، اور حکیم مطلق کی خاص حکمت بالغہ کے ماتحت ہر چیز اپنے اپنے کام میں مصروف ہے، ایک لقمہ جو انسان کے منہ تک پہنچتا ہے، اگر اس کی پوری حقیقت پر انسان غور کرے تو معلوم ہوگا کہ اس کی تیاری میں آسمان اور زمین کی تمام قوتیں اور کروڑوں انسانوں اور جانوروں کی محنتیں شامل ہیں، سارے عالم کی قوتیں مہینوں مصروف خدمت رہیں جب یہ لقمہ تیار ہوا، اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انسان اس میں غور و تدبر سے کام لے، اور سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے لے کر زمین تک اپنی تمام مخلوقات کو اس کی خدمت میں لگا رکھا ہے، تو جس ہستی کو اس نے مخدوم کائنات بنا رکھا ہے وہ بھی بیکار و بیہودہ نہیں ہو سکتی، اس کا بھی کوئی کام ہوگا، اس کے ذمے بھی کوئی خدمت ہوگی ۵

ابر و باد و مه و خورشید و فلک در کارند تا تو مانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و سرمانبردار شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

قرآن حکیم نے انسانی آفرینش اور اس کے مقصد حیات کو اس آیت میں واضح فرمایا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِعِبَادِي ۚ (۵۶: ۸۲)

میں نے جن اور انسان کو اور کسی کام کے لئے نہیں بنایا بجز اس کے کہ وہ میری عبادت کریں

تقریر مذکور سے معلوم ہوا کہ رَبِّ الْعَالَمِينَ ایک حیثیت سے پہلے جملے الْحَمْدُ لِلّٰہ کی دلیل ہے، کہ جب تمام کائنات کی تربیت و پرورش کی ذمہ دار صرف ایک ذات اللہ تعالیٰ کی ہے تو حمد و ثناء کی حقیقی مستحق بھی وہی ذات ہو سکتی ہے، اس لئے پہلی آیت الْحَمْدُ لِلّٰہ رَبِّ الْعَالَمِينَ میں حمد و ثناء کے ساتھ ایمان کے سب سے پہلے رکن توحید باری تعالیٰ کا بیان بھی مؤثر انداز میں آگیا۔

دوسری آیت میں صفت رحمت کا ذکر بلفظ صفت رَحْمَن و رَحِيم کیا گیا ہے، یہ دونوں صیغے مبالغہ کے ہیں جن میں رحمت خداوندی کی وسعت و کثرت اور کمال کا بیان ہے، اس صفت کے ذکر کرنے میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ یہ تمام کائنات و مخلوقات کی تربیت و پرورش کی ذمہ داری جو حق تعالیٰ نے اپنے ذمے رکھی ہے وہ کسی اپنی ضرورت یا دباؤ اور مجبوری سے نہیں، بلکہ یہ سب کچھ اس کی صفت رحمت کا تقاضا ہے، اگر پوری کائنات نہ ہو تو اس کا کچھ نقصان نہیں، اور ہو جائے تو اس پر کچھ بار نہیں ۵

نہ تنہا بدی چونکہ خلقت نبود، نہ چون کردہ شد بر تو ز رحمت فزود

مِلْكِ يَوْمِ الدِّينِ لفظ مَالِك ملک سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز پر ایسا قبضہ کہ وہ اس میں تصرف کرنے کی جائز قدرت رکھتا ہو (قاموس) لفظ دین کے معنی جزاء دینا مِلْكِ يَوْمِ الدِّينِ کا لفظی ترجمہ ہوا "مالک روز جزاء کا" یعنی روز جزاء میں ملکیت رکھنے والا، وہ ملکیت کس چیز پر ہوگی؟ اس کا ذکر نہیں کیا گیا، تفسیر کشاف میں ہے کہ اس میں اشارہ عموم کی طرف ہے، یعنی روز جزاء میں تمام کائنات اور تمام امور کی ملکیت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہوگی (کشاف) روز جزاء کی حقیقت | اب یہاں چند باتیں قابل غور ہیں؛

اور عقلاً اُس کی ضرورت | اول یہ کہ روز جزاء کس دن کا نام ہے، اور اس کی کیا حقیقت ہے؟ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت تمام کائنات پر جس طرح روز جزاء میں ہوگی ایسے ہی آج بھی ہے، پھر روز جزاء کی کیا خصوصیت ہے؟

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ روز جزاء اس دن کا نام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نیک و بد اعمال کا بدلہ دینے کے لئے مقرر فرمایا ہے، لفظ "روز جزاء" سے ایک عظیم الشان فائدہ یہ حاصل ہوا کہ دنیا نیک و بد اعمال کی جزاء دینا کی جگہ نہیں، بلکہ ایک دارالعمل فرض ادا کرنے کا دفتر ہے، تنخواہ یا صلہ وصول کرنے کی جگہ نہیں، اس سے معلوم ہو گیا کہ دنیا میں کسی کو عیش و عشرت، دولت و راحت سے مالا مال دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک مقبول و محبوب ہے، یا کسی کو بچ و مصیبت میں مبتلا پا کر یہ نہیں مترار دیا جاسکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک معتب و مبغوض ہے، جس طرح دنیا کے دفتروں اور کارخانوں میں کسی کو اپنا فرض ادا کرنے میں مصروف محنت دیکھا جائے تو کوئی عقلمند اس کو مصیبت زدہ نہیں کہتا، اور نہ وہ خود اپنی مشقت کے باوجود اپنے آپ کو گرفتار مصیبت سمجھتا ہے، بلکہ وہ اس محنت و مشقت کو اپنی سب سے بڑی کامیابی تصور کرتا ہے، اور کوئی مہربان اُس کو اس مشقت سے سبکدوش کرنا چاہے تو وہ اسکو اپنا بدترین دشمن خیال کرتا ہے، کیونکہ وہ اس تیس روزہ محنت کے پس پردہ اُس راحت کو دیکھ رہا ہے جو اس کو تنخواہ کی شکل میں ملنے والی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں انبیاء علیہم السلام اور ان کے بعد اولیاء اللہ سب سے زیادہ مصیبت و بلا میں مبتلا ہوتے ہیں، اور وہ اپنی اس حالت پر نہایت مطمئن اور بسا اوقات مسرور نظر آتے ہیں۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

الغرض دنیا کی عیش و عشرت حق و صداقت کی اور رنج و مصیبت بد عملی کی یقینی علامت نہیں ہاں کبھی کبھی کسی عمل کی جزاء یا سزا کا ہلکا سا نمونہ دنیا میں بھی ظاہر کر دیا جاتا ہے، وہ اس کا پورا بدلہ نہیں ہوتا، محض متنبہ کرنے کے لئے ایک نمونہ ہوتا ہے، اس کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے:

”یعنی ہم لوگوں کو (آخرت کے) بڑے عذاب پہلے (بعض اوقات) دنیا میں ایک عذاب قریب کا مزہ چکھا دیتے ہیں تاکہ وہ باز آجائیں“

وَلَنذِيقَهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الَّذِیْ
دُونَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ
لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ○ (۲۱: ۳۲)

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

”ایسا ہوتا ہے عذاب اور آخرت کا عذاب بہت بڑا ہے، اگر وہ سمجھیں“

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ
اَكْبَرُ مَوْكَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ○ (۳۳: ۶۸)

انغرض دنیا کی راحت و مصیبت بعض اوقات تو امتحان اور آزمائش ہوتی ہے، اور کبھی عذاب بھی ہوتی ہے، مگر وہ عمل کا پورا بدلہ نہیں ہوتا، بلکہ ایک نمونہ ہوتا ہے، کیونکہ یہ سب کچھ چند روزہ اور محض عارضی ہے، مدار و معیار وہ راحت و کلفت ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے، اور جو اس عالم سے گزرنے کے بعد عالم آخرت میں آنے والی ہے، اسی کا نام روز جزا ہے، اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ نیک و بد عمل کا بدلہ یا پورا بدلہ اس دنیا میں نہیں ملتا، اور عدل و انصاف اور عقل کا تقاضا ہے کہ نیک و بد اچھا اور بُرا برابر نہ رہے، بلکہ ہر عمل کی جزا یا سزا ملنا چاہئے۔

اس لئے ضروری ہو کہ اس عالم کے بعد کوئی دوسرا عالم ہو، جس میں ہر چھوٹے بڑے اور اچھے بُرے عمل کا حساب اور اس کی جزا یا سزا انصاف کے مطابق ملے، اسی کو قرآن کی اصطلاح میں روز جزا، یا قیامت یا آخرت کہا جاتا ہے، قرآن نے خود اس مضمون کو سورہ مؤمن میں وضاحت بیان فرمایا ہے:

”یعنی مینا اور نابینا اور (ایک) دہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے اور (دوسرے) بدکردار باہم برابر نہیں ہو سکتے، تم لوگ بہت ہی کم سمجھتے ہو، قیامت تو ضرور ہی آکر رہی گی تاکہ ہر ایک عمل کا پورا بدلہ اس کو مل جائے اس کے آنے میں کسی طرح کا شک ہے ہی نہیں، مگر اکثر لوگ نہیں ایمان لاتے؟“

وَمَا یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ
وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُنٰسِقِیْنَ قَلِیْلًا
مَّا تَذَكَّرُوْنَ ○ اِنَّ
السَّاعَةَ لَا تَیۡبُ لَا رَیۡبَ
فِیۡہَا وَلٰكِنۡ اَكْثَرُ النَّاسِ
لَا یُوۡمِنُوْنَ ○ (آیت نمبر ۵۸-۵۹)

مالک کون ہے؟ | مَلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ میں دوسری قابل غور بات یہ ہو کہ ہر اہل عقل کے نزدیک یہ بات بدیہی اور بالکل ظاہر ہے کہ حقیقی مالک تمام کائنات کے ذرے ذرے کی وہی ذات پاک ہے، جس نے ان کو پیدا کیا، بڑھایا، تربیت کی، اور جس کی ملکیت ہر چیز پر مکمل ہے، ظاہر پر بھی باطن پر بھی زندہ پر بھی مُردہ پر بھی، اور جس کی ملکیت کی نہ کوئی ابتداء ہے نہ انتہاء، بخلاف انسان کی ملکیت کے کہ وہ ابتداء و انتہاء کے دائرے میں محدود ہے، پہلے نہیں تھی اور پھر نہ رہی گی، نیز اس کی ملکیت

تصرف اشیاء کے ظاہر پر ہے، باطن پر نہیں، زندہ پر ہے مردہ پر نہیں، اس لئے ہر اہل بصیرت کے نزدیک صرف روز جزاء کی نہیں بلکہ دنیا میں بھی تمام کائنات کی حقیقی ملکیت صرف حق تعالیٰ ہی کی ہے، پھر اس آیت میں اللہ تعالیٰ کو خاص روز جزاء کا مالک فرمانے میں کیا حکمت ہے؟ سو قرآن کی دوسری آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوا کہ دنیا میں بھی اگرچہ حقیقی اور مکمل ملکیت تمام کائنات پر صرف پروردگار عالم ہی کی ہے، لیکن اسی نے اپنے کرم اور حکمت بالغہ سے ایک قسم کی ناقص ملکیت انسان کو بھی عطا فرما رکھی ہے، اور دنیا کے قوانین میں اس کی ملکیت کا کافی احترام بھی کیا گیا ہے، آج کی دنیا میں انسان مال و دولت کا مالک ہے، زمین جائیداد کا مالک ہے، کوٹھی، بنگلہ اور منیر چکر کا مالک ہے، چشم و خدم کا مالک ہے، اور یہ ناقص سی ملکیت جو اس کو محض آزمائش کے لئے دی گئی تھی، وہ اسی میں مغرور و بدست ہو گیا، اس آیت میں حق تعالیٰ نے **مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ** فسر ما کر اس مغرور و غافل انسان کو آگاہ فرمایا کہ یہ ملکیتیں اور سب تعلقات و روابط صرف چند روز کے لئے ہیں، ایک دن ایسا آنے والا ہے جس میں کوئی کسی چیز کا ظاہری طور پر بھی مالک نہ رہے گا، نہ کوئی کسی کا خادم رہے گا، نہ مخدوم، نہ کوئی کسی کا آقا رہے گا نہ غلام، تمام کائنات کی ملک اور ملک صرف ایک ذات پاک اللہ تعالیٰ ہی کی ہوگی۔

اس آیت کی پوری تفسیر اور روز جزاء کی وضاحت سورۃ مؤمن کی ان آیات میں ہے:

يَوْمَ هُمْ بَارُزُونَ لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ الْيَوْمَ تُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ

إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ (آیت نمبر ۱۶-۱۷)

اس میں روز جزاء کا بیان کرتے ہوئے فرمایا:

”جس دن سب لوگ (خدا کے) سامنے آمو جو دہوں گے (کہ) ان کی کوئی بات خدا سے (سورۃ) بھی مخفی نہ رہے گی، آج کے روز کس کی حکومت ہوگی؟ بس اللہ ہی کی ہوگی، جو یکتا اور غالب ہے، آج ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے گا، آج کسی پر ظلم نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والے ہیں“

سورۃ فاتحہ کے شروع میں بیان کیا گیا تھا کہ اس سورۃ کی تین ابتدائی آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کا بیان ہے، یہ تینوں آیتیں آچکیں، اور ان کی تفسیر میں آپ یہ بھی معلوم کر چکے کہ پہلی دو آیتوں میں حمد و ثناء کے ضمن میں ایمان کے بنیادی اصول، اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید کا بیان بھی ایک معجزانہ انداز میں آگیا ہے، اس تیسری آیت کی تفسیر میں آپ نے اب معلوم کر لیا، کہ اس کے صرف دو لفظوں میں حمد و ثناء کے ساتھ اسلام کے عظیم الشان انقلابی عقیدہ یعنی قیامت و آخرت

کا بیان بھی مع دلیل کے آگیا، اب چوتھی آیت کا بیان آتا ہے:

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ اس آیت میں ایک پہلو حمد و ثناء کا اور دوسرا دعا و درخواست کا ہے، نَعْبُدُ عبادت سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی کی انتہائی تعظیم و محبت کی وجہ سے اس کے سامنے اپنی انتہائی عاجزی اور سربسازمانبرداری کا اظہار، نَسْتَعِينُ استعانت سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی سے مدد مانگنا، آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں، انسان پر تین حالات گذرتے ہیں، ماضی، حال، مستقبل، پچھلی تین آیتوں میں سے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ اور الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ میں انسان کو اس پر متنبہ کر دیا گیا کہ وہ اپنے ماضی اور حال میں صرف اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے، کہ اس کو ماضی میں نابود سے بود کیا، اور اس کو تمام کائنات سے زیادہ بہترین شکل و صورت اور عقل و بصیرت عطا فرمائی، اور حال میں اس کی پرورش اور تربیت کا سلسلہ جاری ہے، اور مِلِّکِ یَوْمِ الدِّیْنِ میں یہ بتا دیا کہ مستقبل میں بھی وہ خدا ہی کا محتاج ہے، کہ روز جزا میں اس کے سوا کسی کا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا، اور جب ان تینوں آیتوں نے یہ واضح کر دیا کہ انسان اپنی زندگی کے تینوں دور میں خدا ہی کا محتاج ہے تو اس کا طبعی اور عقلی تقاضا یہ ہوا کہ عبادت بھی صرف اسی کی کی جائے، کیونکہ عبادت جو انتہائی تعظیم و محبت کے ساتھ اپنی انتہائی عاجزی اور تذلل کا نام ہے، وہ کسی دوسری ہستی کے لائق نہیں، اس کا نتیجہ لازمی یہ ہے کہ ایک عاقل انسان پکاراٹھے کہ ہم تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے، اسی مقتضائے طبع کو إِيَّاكَ نَعْبُدُ میں ظاہر فرمایا گیا ہے، اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ حاجت روا صرف ایک ہی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے تو اقتضائے عقلی و طبعی یہ ہے کہ اپنے کاموں میں مدد بھی صرف اسی سے مانگنا چاہئے، اسی اقتضائے عقل و طبع کو وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ (روح البیان)

غرض اس چوتھی آیت میں ایک حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء ہے کہ عبادت و اعانت کے لائق صرف وہی ہے، اور دوسری حیثیت سے انسان کی دعا و درخواست ہے کہ ہماری مدد فرمائے اور تیسری حیثیت اور بھی ہے کہ اس میں انسان کو اس کی تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرے، اور حقیقی طور پر اللہ کے سوا کسی کو حاجت روا نہ سمجھے، اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے، کسی نبی یا ولی وغیرہ کو وسیلہ قرار دے کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا اس کے منافی نہیں۔

اس آیت میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ارشاد یہ ہے کہ ہم تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں، کس کام میں مدد مانگتے ہیں اس کا ذکر نہیں، جہور مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کا ذکر نہ کرنے میں عموم کی طرف اشارہ ہے، کہ ہم اپنی عبادت اور ہر دینی و دنیوی کام اور ہر مقصد میں صرف آپ ہی کی مدد چاہتے ہیں۔ پھر عبادت صرف نماز روزے کا نام نہیں، امام غزالیؒ نے اپنی کتاب اربعین میں عبادت کی

دن قیس لکھی ہیں: نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، تلاوت قرآن، ہر حالت میں اللہ کا ذکر کرنا، حلال روزی کے لئے کوشش کرنا، پڑوشی اور ساتھی کے حقوق ادا کرنا، لوگوں کو نیک کاموں کا حکم کرنا اور برے کاموں سے منع کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرنا۔ اس لئے عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنے کے معنی یہ ہو گئے کہ نہ کسی کی محبت اللہ تعالیٰ کے برابر ہو، نہ کسی کا خوف اس کے برابر ہو، نہ کسی سے امید اس کی طرح ہو، نہ کسی پر بھروسہ اللہ کے مثل ہو، نہ کسی کی اطاعت و خدمت اور کام کو اتنا ضروری سمجھے جتنا اللہ تعالیٰ کی عبادت کو، نہ اللہ تعالیٰ کی طرح کسی کی نذر اور منت مانے، نہ اللہ تعالیٰ کی طرح کسی دوسرے کے سامنے اپنی مکمل عاجزی اور تذلل کا اظہار کرے، نہ وہ افعال کسی دوسرے کے لئے کرے جو انتہائی تذلل کی علامات ہیں، جیسے رکوع و سجدہ۔

آخری تین آیتیں جن میں انسان کی دعا، درخواست کا مضمون ہے اور ایک خاص دعا کی تلقین ہو رہی ہے: **إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝** جس کا ترجمہ یہ ہے: کہ بتلا دیجئے ہم کو راستہ سیدھا، راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا، نہ راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا، اور نہ اُن لوگوں کا جو راستہ سے گم ہو گئے۔

ان تینوں آیات میں چند باتیں قابل غور ہیں:

تکملہ لہرایہ فی تفصیل درجۃ الہدایہ | یہاں پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ صراط مستقیم کی ہدایت کے لئے دعا جو اس آیت میں تعلیم فرمائی گئی ہے اس کے مخاطب جس طرح تمام انسان اور عامہ مومنین ہیں، اسی طرح اولیاء اللہ اور حضرات انبیاء علیہم السلام بھی اس کے مامور ہیں، جو بلاشبہ ہدایت یافتہ بلکہ دوسروں کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہیں، پھر اس حاصل شدہ چیز کی بار بار دعا مانگنے کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب ہدایت کی پوری حقیقت معلوم کرنے پر موقوف ہے، اس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، جس سے سوال مذکور کے علاوہ ان تمام اشکالات کا بھی جواب معلوم ہو جائیگا جو مفہوم ہدایت کے متعلق قرآن کریم کے بہت سے مقامات میں عموماً پیش آتے ہیں، اور ہدایت کی حقیقت سے نا آشنا قرآن کی بہت سی آیات میں باہمی تضاد و اختلاف محسوس کرنے لگتا ہے۔

لفظ ہدایت کی بہترین تشریح امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں تحریر فرمائی ہے، جس کا حنلاصہ یہ ہے کہ ہدایت کے صلی معنی ہیں کسی شخص کو منزل مقصود کی طرف مہربانی کے ساتھ رہنمائی کرنا، اور ہدایت کرنا حقیقی معنی میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہے، جس کے مختلف درجات ہیں:

ایک درجہ ہدایت کا عام ہے، جو کائنات و مخلوقات کی تمام اقسام جمادات، نباتات،

حیوانات وغیرہ کو شامل ہے، یہاں آپ یہ خیال نہ کریں کہ ان بے جان بے شعور چیزوں کو ہدایت سے کیا کام؟

کیونکہ قرآنی تعلیمات سے یہ واضح ہے کہ کائنات کی تمام اقسام اور ان کا ذرہ ذرہ اپنے اپنے درجے کے موافق حیات و احساس بھی رکھتا ہے اور عقل و شعور بھی، یہ دوسری بات ہے کہ یہ جو ہر کسی نوع میں کم کسی میں زیادہ ہے، اسی وجہ سے جن اشیاء میں یہ جو ہر بہت کم ہے اُن کو بے جان بے شعور سمجھا اور کہا جاتا ہے، احکام الہیہ میں بھی اُن کے ضعف شعور کا اتنا اثر آیا کہ ان کو احکام کا مکلف نہیں بنایا گیا جن مخلوقات میں حیات کے آثار تو نمایاں ہیں مگر عقل و شعور نمایاں نہیں، ان کو ذی حیات، جاندار مگر بے عقل و شعور کہا جاتا ہے، اور جن میں حیات کے ساتھ عقل و شعور کے آثار بھی نمایاں نظر آتے ہیں اُن کو ذی عقل و شعور کہا جاتا ہے، اور اسی اختلاف درجات اور عقل و شعور کی کمی بیشی کی وجہ سے تمام کائنات میں احکام شرعیہ کا مکلف صرف انسان و جنات کو قرار دیا گیا ہے، کہ ان میں عقل و شعور بھی مکمل ہے، مگر اس کے معنی نہیں کہ دوسری انواع و اقسام میں حیات و احساس یا عقل و شعور بالکل نہیں، کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد:

وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ
وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ ط
(سورۃ بنی اسرائیل: ۴۴)

”یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی (قالا یا حالاً) بیان نہ کرتی ہو لیکن تم لوگ اُن کی پاکی بیان کرنے کو سمجھتے نہیں ہو“

اور سورۃ نور میں ارشاد ہے:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ
فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرِ
صَبَّحًا كُلُّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ
وَتَسْبِيحَهُ ط وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا
يَفْعَلُونَ ○ (آیت نمبر ۴۱)

”یعنی کیا تجھ کو معلوم نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں (مخلوقات) ہیں اور (بالخصوص) پرندے جو پر پھیلا ہو کر اڑتے پھرتے ہیں، سب کو اپنی اپنی عام اور تسبیح معلوم ہے، اور اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کے سب افعال کا پورا علم ہے“

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور اس کی پاکی بیان کرنا اللہ تعالیٰ کی معرفت پر موقوف ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہی سب سے بڑا علم ہے، اور یہ علم بدون عقل و شعور کے نہیں ہو سکتا اس لئے ان آیات سے ثابت ہوا کہ تمام کائنات کے اندر روح و حیات بھی ہے، ادراک و احساس بھی عقل و شعور بھی، مگر بعض کائنات میں یہ جو ہر اتنا کم اور مخفی ہے کہ عام دیکھنے والوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا، اسی لئے عرف میں ان کو بے جان یا بے عقل کہا جاتا ہے، اور اس بنا پر اُن کو احکام شرعیہ کا مکلف بھی نہیں بنایا گیا، قرآن کا یہ فیصلہ اُس وقت کا ہے جب دنیا میں نہ کہیں کوئی فلسفی تھا، نہ

کوئی فلسفہ مدون تھا، بعد میں آنے والے فلاسفوں نے بھی اپنے اپنے وقت میں اس کی تصدیق کی، قدیم فلاسفہ میں بھی اس خیال کے کچھ لوگ گذرے ہیں، اور جدید فلاسفہ اور اہل سنس نے تو پوری وضاحت کے ساتھ اس کو ثابت کیا ہے۔

الغرض ہدایت خداوندی کا یہ درجہ اولیٰ تمام مخلوقات، جمادات، نباتات، حیوانات، انسان اور جنات کو شامل ہے، اسی ہدایت عامہ کا ذکر قرآن کریم کی آیت اَعْلٰی كُلِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ثُمَّ هَدٰی (۵۰:۲۰) میں فرمایا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا فرمائی، پھر اس خلقت کے مناسب اس کو ہدایت دی، اور یہی مضمون سورۃ اعلیٰ میں ان الفاظ سے ارشاد ہوا:

سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی ۝ الَّذِیْ	”یعنی آپ اپنے پروردگار عالی شان کی تسبیح کیجئے“
خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ	جس نے ساری مخلوقات کو بنایا، پھر ٹھیک
فَهَدٰی ۝	بنایا، اور جس نے تجویز کیا، پھر راہ بتائی“

یعنی جس نے تمام مخلوقات کے لئے خاص خاص مزاج اور خاص خاص خدمتیں تجویز فرما کر ہر ایک کو اس کے مناسب ہدایت کر دی۔

اسی ہدایت عامہ کا نتیجہ ہے کہ کائنات عالم کے تمام انواع و اصناف اپنا اپنا مقررہ فرض نہایت سلیقہ سے ادا کر رہے ہیں، جو چیز جس کام کے لئے بنادی ہے وہ اس کو ایسی خوبی کے ساتھ ادا کر رہی ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، حضرت مولانا رومیؒ نے اسی مضمون کو بیان فرمایا ہے

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند

بامن و تو مردہ، باحق زندہ اند

زبان سے نکلی ہوئی آواز کے معنی کا ادراک نہ ناک کر سکتی ہے نہ آنکھ، حالانکہ یہ زبان سے زیادہ قریب ہیں اس ادراک کا فریضہ اللہ تعالیٰ نے کانوں کے سپرد کیا ہے، وہی زبان کی بات کو لیتے ہیں اور ادراک کرتے ہیں، دانائے رومؒ نے خوب فرمایا ہے

مرزباں رامشتری جز گوش نیست

واقف این راز جز بے ہوش نیست

اسی طرح کانوں سے دیکھنے یا سونگھنے کا کام نہیں لیا جاسکتا، ناک سے دیکھنے یا سننے کا کام

نہیں لیا جاسکتا، سورۃ مریم میں اسی مضمون کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

اِنَّ كُلَّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	”یعنی کوئی نہیں آسمان اور زمین میں جو نہ آدک
اِلَّا اَتٰی الرَّحْمٰنَ عَبْدًا ۝ (۱۹:۹۳)	رحمن کا بندہ ہو کر“

دوسرا درجہ ہدایت کا اس کے مقابلے میں خاص ہے، یعنی صرف اُن چیزوں کے ساتھ مخصوص

ہر جو عرف میں ذوقی العقول کہلاتی ہیں، یعنی انسان اور جن، یہ ہدایت انبیاء اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ ہر انسان کو پہنچتی ہے، پھر کوئی اس کو قبول کر کے مومن و مسلم ہو جاتا ہے کوئی رد کر کے کافر ٹھہرتا ہے۔ تیسرا درجہ ہدایت کا اس سے بھی زیادہ خاص ہے کہ صرف مومنین و متقین کے ساتھ مخصوص ہے، یہ ہدایت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلا واسطہ انسان پر فائض ہوتی ہے، اس ہدایت کا دوسرا نام توفیق ہے، یعنی ایسے اسباب اور حالات پیدا کر دینا کہ قرآنی ہدایات کا قبول کرنا اور ان پر عمل کرنا آسان ہو جائے، اور ان کی خلاف ورزی دشوار ہو جائے، اس تیسرے درجے کی وسعت غیر محدود اور اس کے درجات غیر مستناہی ہیں، یہی درجہ انسان کی ترقی کا میدان ہے، اعمال صالحہ کے ساتھ ساتھ اس درجہ ہدایت میں زیادتی ہوتی رہتی ہے، قرآن کریم کی متعدد آیات میں اس زیادتی کا ذکر ہے مثلاً: وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (۱۷:۲۷) وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ اللَّهُ قَلْبَهُ ط "جو شخص اللہ پر ایمان لائے اس کے دل کو ہدایت کر دیتے ہیں۔"

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۶۹:۲۹) | "جو لوگ ہمارے راستے میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستوں کی مزید ہدایت کر دیتے ہیں"

یہی وہ میدان ہے جہاں ہر بڑے سے بڑا نبیؐ و رسولؐ اور ولی اللہؑ آخر عمر تک زیادتی ہدایت و توفیق کا طالب نظر آتا ہے، اسی مقام ہدایت کے متعلق مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے

اے برادر بے نہایت درگے ست
ہر چہ بروئے میری بروئے مایست
اور سعدی شیرازیؒ نے فرمایا ہے

نگویم کہ برآب قادر نسیند
کہ بر ساحل نیل مستقی اند

درجات ہدایت کی اس تشریح سے آپؐ نے سمجھ لیا ہو گا کہ ہدایت ایک ایسی چیز ہے جو سب کو حاصل بھی ہے، اور اس کے مزید درجات عالیہ حاصل کرنے سے کسی بڑے سے بڑے انسان کو استغناء بھی نہیں، اسی لئے سورہ فاتحہ کی اہم ترین دعاء ہدایت کو قرار دیا گیا، جو ایک ادنیٰ مومن کے لئے بھی مناسب حال ہے، اور بڑے سے بڑے رسولؐ اور ولیؑ کے لئے بھی اتنی ہی اہم ہے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر عمر میں سورہ فتح کے اندر فتح مکہ کے فوائد و ثمرات بتلاتے ہوئے یہ بھی ارشاد ہوا کہ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا، یعنی مکہ مکرمہ اس لئے آپؐ کے ہاتھوں فتح کرایا گیا تاکہ آپؐ کو صراطِ مستقیم کی ہدایت ہو، ظاہر ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے نہ صرف ہدایت یافتہ بلکہ دوسروں کے لئے بھی ہدایت مجتم تھے، پھر اس موقع پر آپؐ کو ہدایت ہونے کے اس کے سوا کوئی معنی نہیں ہو سکتے کہ ہدایت

کا کوئی بہت اعلیٰ مقام آپ کو اس وقت حاصل ہوا۔

ہدایت کی اس تشریح سے آپ کے لئے فہمِ قرآن میں بہت سے فوائد حاصل ہو گئے۔

اول یہ کہ قرآن میں کہیں تو ہدایت کو ہر مومن و کافر کے لئے بلکہ کل مخلوقات کے لئے عام فرمایا گیا ہے، اور کہیں اس کو محض متقین کے ساتھ مخصوص لکھا گیا، جس میں ناواقف کو تعارض کا شبہ ہو سکتا ہے، ہدایت کے عام و خاص درجات معلوم ہونے کے بعد یہ شبہ خود بخود رفع ہو جاتا ہے کہ ایک درجہ سب کو عام اور شامل ہے، اور دوسرا درجہ مخصوص ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ قرآن میں ایک طرف تو جگہ جگہ یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالمین یا فاسقین کو ہدایت نہیں فرماتے، اور دوسری طرف مکرر سکڑ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت فرماتے ہیں، اس کا جواب بھی درجات کی تفصیل سے واضح ہو گیا کہ ہدایت عامہ سب کو کی جاتی ہے، اور ہدایت کا تیسرا مخصوص درجہ ظالمین و فاسقین کو نصیب نہیں ہوتا۔

تیسرا فائدہ: یہ ہر کہ ہدایت کے تین درجات میں سے پہلا اور تیسرا درجہ بلا واسطہ حق تعالیٰ کا فعل ہے، اس میں کسی نبی یا رسول کا دخل نہیں، انبیاء علیہم السلام اور رسولوں کا کام صرف دوسرے درجہ ہدایت سے متعلق ہے۔

قرآن کریم میں جہاں کہیں انبیاء علیہم السلام کو ہادی قرار دیا ہے وہ اسی دوسرے درجے کے اعتبار سے ہے، اور جہاں یہ ارشاد ہے: **إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ** (۵۶: ۲۸) یعنی ”آپ ہدایت نہیں کر سکتے جسکو چاہیں“ تو اس میں ہدایت کا تیسرا درجہ مراد ہے یعنی توفیق دینا آپ کا کام نہیں۔

الغرض **إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ** ایک جامع اور اہم ترین دعا ہے جو انسان کو سکھائی گئی ہے، انسان کا کوئی فرد اس سے بے نیاز نہیں، دین اور دنیا دونوں میں صراطِ مستقیم کے بغیر فلاح و کامیابی نہیں، دنیا کی اُلجھنوں میں بھی صراطِ مستقیم کی دعا نسخہ اکسیر ہے، مگر لوگ توجہ نہیں کرتے، ترجمہ اس آیت کا یہ ہر کہ بتلا دیجئے ہم کو راستہ سیدھا۔

صراطِ مستقیم کونسا راستہ ہے؟ | سیدھا راستہ وہ ہے جس میں موڑ نہ ہوں، اور مراد اس سے دین کا وہ راستہ ہے جس میں افراط اور تفريط نہ ہو، افراط کے معنی حد سے آگے بڑھنا اور تفريط کے معنی کوتاہی کرنا، پھر اس کے بعد کی دو آیتوں میں اُس صراطِ مستقیم کا پتہ دیا گیا ہے جسکی دعا اس آیت میں تلقین کی گئی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے **صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ** ”یعنی راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا“ اور وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا ان کی تفصیل ایک دوسری آیت میں اس طرح آئی ہے: **الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ط** یعنی وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا، یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین، مقبولانِ بارگاہِ الہی

کے یہ چار درجات ہیں، جن میں سب اعلیٰ انبیاء علیہم السلام ہیں، اور صدیقین وہ لوگ ہیں جو انبیاء کی امت میں سب زیادہ رتبے کے ہوتے ہیں، جن میں کمالات باطنی بھی ہوتے ہیں، عرف میں اُن کو ادکیا کہا جاتا ہے، شہداء وہ ہیں جنہوں نے دین کی محبت میں اپنی جان تک دیدی، اور صلحاء وہ ہیں جو شریعت کے پورے متبع ہوتے ہیں، واجبات میں بھی مستحبات میں بھی، جن کو عرف میں نیک دیندار کہا جاتا ہے۔

اس آیت میں پہلے مثبت اور ایجابی طریق سے صراطِ مستقیم کو متعین کیا گیا ہے کہ ان چار طبقوں کے حضرات جس راستے پر چلیں وہ صراطِ مستقیم ہے، اس کے بعد آخر کی آیت میں سلبی اور منفی صورت سے اس کی تعیین کی گئی ہے، ارشاد ہے:

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝ یعنی نہ راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا، اور نہ اُن لوگوں کا جو راستے سے گم ہو گئے، "مَغْضُوبٌ عَلَيْهِمْ" سے وہ لوگ مراد ہیں جو دین کے احکام کو جاننے پہچاننے کے باوجود شرارت یا نفسانی اغراض کی وجہ سے اُن کی خلاف ورزی کرتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں احکامِ الہیہ کی تعمیل میں کوتاہی (یعنی تفسرِ لٹ) کرتے ہیں، جیسے عام طور پر یہود کا حال تھا، کہ دنیا کے ذلیل مفاد کی خاطر دین کو قربان کرتے اور انبیاء کی توہین کرتے تھے، اور ضَّالِّینَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ناواقفیت اور جہالت کے سبب دین کے معاملے میں غلط راستے پر پڑ گئے، اور دین کی معتبرہ حدود سے بیکل کمر افراط اور غلو میں مبتلا ہو گئے، جیسے عام طور پر نصاریٰ تھے، کہ نبی کی تعظیم میں اتنے بڑھے کہ انھیں کو خدا بنا لیا، ایک طرف یہ ظلم کہ اللہ کے انبیاء کی بات نہ مانیں، انھیں قتل تک کرنے سے گریز نہ کریں، اور دوسری طرف یہ زیادتی کہ ان کو خدا بنالیں۔

آیت کا حاصل مطلب یہ ہوا کہ ہم وہ راستہ نہیں چاہتے جو اغراضِ نفسانی کے تابع بدعمل اور دین میں تفسرِ لٹ کرنے والوں کا ہے، اور نہ وہ راستہ چاہتے ہیں جو جاہل گمراہ اور دین میں غلو (افراط) کرنے والوں کا ہے، بلکہ اُن کے درمیان کا سیدھا راستہ چاہتے ہیں، جس میں نہ افراط ہے نہ تفسرِ لٹ، اور جو شہوات اور اغراضِ نفسانی کے اتباع سے نیز شبہات اور عقائدِ فاسدہ سے پاک ہے۔

سورۃ فاتحہ کی ساتوں آیات کی تفسیر ختم ہو گئی، اس پوری سورت کا خلاصہ اور حاصل مطلب دعا ہے کہ یا اللہ ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرما، اور چونکہ دنیا میں صراطِ مستقیم کا پہچاننا ہی سب سے بڑا علم اور بڑی کامیابی ہے، اور اسی کی پہچان میں غلطی ہونے سے اقوامِ عالم تباہ ہوتی ہیں، ورنہ خدا طلبی اور اس کے لئے مجاہدات کی تو بہت سے کفار میں بھی کوئی کمی نہیں، اسی لئے قرآن نے صراطِ مستقیم کو پوری وضاحت کے ساتھ ایجابی اور سلبی دونوں پہلوؤں سے واضح فرمایا ہے۔

صراطِ مستقیم کتاب اللہ اور رجال اللہ | یہاں ایک بات قابلِ غور ہے اور اس میں غور کرنے سے ایک بڑے علم کا دروازہ کھلتا ہے، وہ یہ کہ صراطِ مستقیم کی تعیین کیلئے بظاہر مضامین یہ تھی کہ صراطِ الرسول صراطِ القرآن فرما دیا جاتا

جو مختصر بھی تھا اور واضح بھی، کیونکہ پورا قرآن درحقیقت صراطِ مستقیم کی تشریح ہے، اور پوری تعلیماتِ رسول اسی کی تفصیل، لیکن قرآن کی اس مختصر سورت میں اختصار اور وضاحت کے اس پہلو کو چھوڑ کر صراطِ مستقیم کی تعیین کے لئے اللہ تعالیٰ نے مستقل دو آیتوں میں ایجابی اور سلبی پہلوؤں سے صراطِ مستقیم کو اس طرح متعین فرمایا کہ اگر سیدھا راستہ چاہتے ہو تو ان لوگوں کو تلاش کرو اور ان کے طریق کو اختیار کرو، قرآن کریم نے اس جگہ نہ یہ فرمایا کہ قرآن کا راستہ اختیار کرو، کیونکہ محض کتاب انسانی تربیت کے لئے کافی نہیں، اور نہ یہ فرمایا کہ رسول کا راستہ اختیار کرو، کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یقار اس دنیا میں دائمی نہیں، اور آپ کے بعد کوئی دوسرا رسول اور نبی نہیں، اس لئے صراطِ مستقیم جن لوگوں کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے اُن میں نبیین کے علاوہ ایسے حضرات بھی شامل کر دیئے گئے، جو تا قیامت ہمیشہ موجود رہیں گے، مثلاً صدیقین، شہداء اور صالحین۔

خلاصہ یہ ہے کہ سیدھا راستہ معلوم کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے کچھ رجال اور انسانوں کا پتہ دیا، کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا، ایک حدیث میں ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو خبر دی کہ پچھلی امتوں کی طرح میری امت بھی ستر فرقوں میں بٹ جائے گی، اور صرف ایک جماعت ان میں حق پر ہوگی، تو صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا کہ وہ کونسی جماعت ہے؟ اس پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جواب دیا ہے اس میں بھی کچھ رجال اللہ ہی کا پتہ دیا گیا ہے، فرمایا: ”ما انا علیہ اصحابی“ یعنی حق پر وہ جماعت ہوگی جو میرے اور میرے صحابہ کے طرز پر ہو۔

اس خاص طرز میں شاید اس کی طرف اشارہ ہو کہ انسان کی تعلیم و تربیت محض کتابوں اور روایتوں سے نہیں ہو سکتی، بلکہ رجال ماہرین کی صحبت اور ان سے سیکھ کر حاصل ہوتی ہے، یعنی درحقیقت انسان کا معلم اور مربی انسان ہی ہو سکتا ہے، محض کتاب معلم اور مربی نہیں ہو سکتی، بقول اکبر مرحومؒ

کورس تو لفظ ہی سیکھاتے ہیں
آدمی، آدمی بناتے ہیں

اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو دنیا کے تمام کاروبار میں مشاہد ہے، کہ محض کتابی تعلیم سے نہ کوئی کپڑا سینا سیکھ سکتا ہے، نہ کھانا پکانا، نہ ڈاکٹری کی کتاب پڑھ کر کوئی ڈاکٹر بن سکتا ہے، نہ انجینیئر کی کتابوں کے محض مطالعے سے کوئی انجینیئر بنتا ہے، اسی طرح قرآن و حدیث کا محض مطالعہ انسان کی تعلیم اور حلقہ تربیت کے لئے ہرگز کافی نہیں ہو سکتا، جب تک اس کو کسی محقق ماہر سے باقاعدہ حاصل نہ کیا جائے، قرآن و حدیث کے معاملے میں بہت سے لکھے پڑھے آدمی اس مغالطے میں مبتلا ہیں کہ محض ترجمے یا تفسیر دیکھ کر وہ قرآن کے ماہر ہو سکتے ہیں، یہ بالکل فطرت کے خلاف تصور ہے، اگر محض کتاب کافی ہوتی تو رسولوںؐ کے بھیجے کی ضرورت نہ تھی، کتاب کے ساتھ رسول کو معلم بنا کر بھیجا اور

صراط مستقیم کو متعین کرنے کے لئے اپنے مقبول بندوں کی فہرست دینا اس کی دلیل ہے کہ محض کتاب کا مطالعہ تعلیم و تربیت کے لئے کافی نہیں، بلکہ کسی ماہر سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان کی صلاح و فلاح کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک کتاب اللہ جس میں انسانی زندگی کے ہر شعبے سے متعلق احکام موجود ہیں، دوسرے رجال اللہ، یعنی اللہ والے، ان سے استفادے کی صورت یہ ہے کہ کتاب اللہ کے معروف اصول پر رجال اللہ کو پرکھا جائے، جو اس معیار نہ اُتریں، ان کو رجال اللہ ہی نہ سمجھا جائے، اور جب رجال اللہ صحیح معنی میں حاصل ہو جائیں، تو ان سے کتاب اللہ کا مفہوم سیکھنے اور عمل کرنے کا کام لیا جائے۔

فرقہ دارانہ اختلافات | یہی ہے کہ کچھ لوگوں نے صرف کتاب اللہ کو لے لیا، رجال اللہ سے قطع نظر کر لی، اُن کی تفسیر و تعلیم کو کوئی حیثیت نہ دی، اور کچھ لوگوں نے صرف رجال اللہ کو معیار حق سمجھ لیا، اور کتاب اللہ سے آنکھ بند کر لی، اور ان دونوں طریقوں کا نتیجہ مگر ایسی ہی

سورة فاتحہ کے متعلق احکام و مسائل

سورة فاتحہ میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء ہے، پھر صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کا اقرار اور اس کا اظہار ہے کہ ہم اس کے سوا کسی کو اپنا حاجت روا نہیں سمجھتے، یہ گویا حلف و فاداری ہے جو انسان اپنے رب کے ساتھ کرتا ہے، اس کے بعد پھر ایک اہم دعا ہے جو تمام انسانی مقاصد و ضروریات پر حاوی ہے، اور اس میں بہت سے فوائد اور مسائل ضمنی آئے ہیں، ان میں سے چند اہم مسائل کو لکھا جاتا ہے :-

دعا کرنے کا طریقہ | (۱) اس خاص اسلوب کلام کے ذریعہ انسان کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب اللہ جل شانہ سے کوئی دعا و درخواست کرنا ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کی حمد و ثناء کا فرض بجالا کر پھر حلف و فاداری اس بات کا کر دے کہ ہم اس کے سوا نہ کسی کو لائق عبادت سمجھتے ہیں اور نہ کسی کو حقیقی معنی میں مشکل کشا اور حاجت روا مانتے ہیں، اس کے بعد اپنے مطلب کی دعا کر دے، اس طریقہ سے جو دعا کی جائے اس کے قبول ہونے کی قوی امید ہے (احکام حصّاص)

اور دعا میں بھی ایسی جامع دعا خیر تیار کر د جس میں اختصار کے ساتھ انسان کے تمام مقاصد داخل ہو جائیں، جیسے ہدایت صراط مستقیم کہ دنیا و دین کے ہر کام میں اگر انسان کا راستہ سیدھا ہو جائے تو کہیں ٹھوکر لگنے اور نقصان پہنچنے کا خطرہ نہیں رہتا، غرض اس جگہ خود حق تعالیٰ کی طرف سے اپنی حمد و ثناء بیان کرنے کا اصل مقصد انسان کو تعلیم دینا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء | (۲) اس سورت کے پہلے جملے میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرنے کی تعلیم و ترغیب انسان کا فطری فطرہ ہے، مگر حمد کسی نعمت یا صفت کی بنا پر ہوا کرتی ہے، یہاں کسی نعمت یا صفت

کا ذکر نہیں، اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں، اُن کا کوئی انسان احاطہ نہیں کر سکتا، جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے: **وَإِنْ تَعَدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا** (۳۴: ۱۳) یعنی ”اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے“ انسان اگر سارے عالم کو چھوڑ کر اپنے ہی وجود پر نظر ڈال لے تو معلوم ہو گا کہ اس کا وجود خود ایک عالم اصغر ہے جس میں عالم اکبر کے سارے نمونے موجود ہیں، اس کا بدن زمین کی مثال ہے، اُس پر اُگنے والے بال نباتات کی مثال ہیں، اُس کی ہڈیاں پہاڑوں کی شبیہ ہیں، اس کے بدن کی رگیں جس میں خون رواں ہے زمین کے نیچے بہنے والے چشموں اور نہروں کی مثال ہیں۔

انسان دو جز سے مرکب ہے، ایک بدن دوسرے روح، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قدر و قیمت کے اعتبار سے روح اصل، اعلیٰ اور افضل ہے، بدن محض اس کے تابع اور ادنیٰ درجہ رکھتا ہے، اس ادنیٰ حبس کے متعلق بدن انسان کی تحقیق کرنے والے اطباء اور اہل تشریح نے بتلایا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے تقریباً پانچ ہزار مصالح اور منافع رکھے ہیں، اس کے بدن میں تین سو سے زیادہ جوڑے ہیں، ہر ایک جوڑے کو اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت کاملہ نے ایسا حکم بنایا ہے کہ ہر وقت کی حرکت کے باوجود نہ وہ گھستا ہے، نہ اس کی مرمت کی ضرورت ہوتی ہے، عادیۃً انسان کی عمر ساٹھ ستر سال ہوتی ہے، پوری عمر اس کے یہ نرم و نازک اعضاء اور اُن کے سب جوڑے اکثر اوقات اس طرح حرکت میں رہتے ہیں کہ فولاد بھی ہوتا تو گھس جاتا، مگر حق تعالیٰ نے فرمایا: **فَخَنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ** (۲۸: ۷۶)، یعنی ”اگر ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا، اور ہم نے ہی اس کے جوڑے بند مضبوط کئے“، اسی قدرتی مضبوطی کا نتیجہ ہے کہ عام عادت کے مطابق یہ نرم و نازک جوڑے ستر برس اور اس سے بھی زیادہ عرصہ تک کام دیتے ہیں، انسانی اعضاء میں سے صرف ایک آنکھ ہی کو لے لیجئے، اس میں جو اللہ تعالیٰ جل شانہ کی حکمت بالغہ کے مظاہر موجود ہیں، انسان کو عمر بھر خرچ کر کے بھی اُن کا پورا ادراک آسان نہیں۔

پھر اس آنکھ کے صرف ایک مرتبہ کے عمل کو دیکھ کر یہ حساب لگائیے کہ اس ایک منٹ کے عمل میں حق تعالیٰ کی کتنی نعمتیں کام کر رہی ہیں، تو حیرت ہوتی ہے، کیونکہ آنکھ اٹھی اور اس نے کسی چیز کو دیکھا، اس میں جس طرح آنکھ کی اندرونی طاقتوں نے عمل کیا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی بیرونی مخلوقات کا اس میں بڑا حصہ ہے، اگر آفتاب کی روشنی نہ ہو تو آنکھ کے اندر کی روشنی کام نہیں دے سکتی، پھر آفتاب کے لئے بھی ایک فضا کی ضرورت ہوتی ہے، انسان کے دیکھنے اور آنکھ کو کام میں لانے کے لئے غذا، ہوا وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ ایک مرتبہ نظر اٹھ کر جو کچھ دیکھتی ہو اس میں پورے عالم کی طاقتیں کام کرتی ہیں، یہ ایک مرتبہ کا عمل ہوا، پھر آنکھ دن میں کتنی مرتبہ دیکھتی اور سال میں کتنی مرتبہ، عمر میں کتنی مرتبہ، یہ ایسا سلسلہ ہے جس کے اعداد و شمار انسانی طاقت سے خارج ہیں۔

اسی طرح کان، زبان، ہاتھ، پاؤں کے جتنے کام ہیں اُن سب میں پورے عالم کی قوتیں شامل

ہو کر کام پورا ہوتا ہے، یہ تو وہ نعمت ہے جو ہر زندہ انسان کو میسر ہے، اُس میں شاہ و گدا، امیر و غریب کا کوئی امتیاز نہیں، اور اللہ جل شانہ کی بڑی بڑی نعمتیں سب ایسی ہی وقف عام ہیں کہ ہر فرد انسانی اُن سے نفع اٹھاتا ہے، آسمان، زمین ان دونوں میں اور اُن کے درمیان پیدا ہونے والی تمام کائنات چاند، سورج، ثابت اور سیارے، ہوا، فضا، کافع ہر جاندار کو پہنچ رہا ہے۔ اس کے بعد اللہ جل شانہ کی نعمائے خاصہ جو انسان کے افراد میں بتقاضائے حکمت کم و بیش کر کے عطا ہوتی ہیں، مال اور دولت، عزت اور جاہ، راحت اور آرام سب اسی قسم میں داخل ہیں، اور اگرچہ یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ نعمائے عامہ جو تمام انسانوں میں مساوی طور پر مشترک ہیں جیسے آسمان، زمین اور ان کی تمام مخلوقات یہ نعمتیں بہ نسبت نعمائے خاصہ مال، دولت وغیرہ کے زیادہ اہم اور اشرف ہیں، مگر بھولا بھالا انسان تمام افسردہ انسان میں عام ہونے کی بنا پر کبھی ان عظیم الشان نعمتوں کی طرف التفات بھی نہیں کرتا، کہ یہ کوئی نعمت ہے، صرف گرد و پیش کی معمولی چیزیں کھانے پینے، رہنے سہنے کی خصوصی چیزیں ہی پر اس کی نظر رک جاتی ہے۔ بہر حال یہ ایک سرسری نمونہ ہے اُن نعمتوں کا جو ہر انسان پر ہر وقت مبذول ہیں، اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا ہی چاہئے کہ انسان اپنی مفتدر بھران احسانات و انعامات کرنے والے کی حمد و ثناء کرے، اور کرتا رہے، اسی کے تقاضائے فطرت کی تلقین کے لئے قرآن کی سب سے پہلی سورت کا سب سے پہلا کلمہ **الْحَمْدُ** لایا گیا ہے، اور اللہ کی حمد و ثناء کو عبادت میں بڑا درجہ دیا گیا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو کوئی نعمت عطا فرمائیں اور وہ اس پر الحمد للہ کہے تو ایسا ہو گیا کہ گویا جو کچھ اس نے لیا ہے اس سے افضل چیز دیدی (قرطبی از ابن ماجہ بروایت انسؓ)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اگر ساری دنیا کی نعمتیں کسی ایک شخص کو حاصل ہو جائیں اور وہ اس پر الحمد للہ کہہ لے تو یہ الحمد للہ اُن ساری دنیا کی نعمتوں سے افضل ہے، "سترطبی نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ الحمد للہ زبان سے کہنا بھی اللہ ہی کی ایک نعمت ہے، اور یہ نعمت ساری دنیا کی نعمتوں سے افضل ہے، اور حدیث صحیح میں ہے کہ الحمد للہ سے میزانِ عمل کا آدھا پلہ بھر جاتا ہے اور حمد کی حقیقت حضرت شقیق بن ابراہیمؒ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تمہیں کوئی چیز عطا فرمائے تو اول اس کے دینے والے کو پہچانو، پھر جو کچھ اس نے دیا ہے اس پر راضی ہو جاؤ، پھر جب تک تمہارے جسم میں اس کی عطا کی ہوئی قوت و طاقت موجود ہے اس کی نافرمانی کے قریب نہ جاؤ (قرطبیؒ)

دوسرا کلمہ **لِلّٰہِ** ہے، اِس میں لفظ اللہ کے ساتھ شروع میں حرف لام لگا ہوا ہے جس کو عربیت کے قاعدے سے لامِ اختصاص کہا جاتا ہے، جو کسی حکم یا وصف کی خصوصیت پر دلالت کرتا ہے، اِس جگہ

معنی یہ ہیں کہ صرف یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء انسان کا فرض ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حمد و ثناء صرف اُسی کی ذاتِ قدوس کے ساتھ مخصوص ہے، حقیقی طور پر اس کے سوا عالم میں کوئی مستحق حمد و ثناء کا نہیں ہو سکتا، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ہاں اس کے ساتھ یہ بھی اس کا انعام ہے کہ انسان کو تہذیبِ اخلاق سکھانے کے لئے اس کو یہ بھی حکم دیدیا کہ میری نعمت و احسان جن واسطوں سے تمھارے ہاتھ آئے ان کا بھی شکر ادا کرو، کیونکہ جو شخص اپنے محسن انسان کا شکر ادا کرنے کا خوگر نہ ہو وہ خدا کا بھی شکر ادا نہیں کرے گا۔

خود اپنی مدح و ثناء کیسے | (۳) خود اپنی حمد و ثناء کا بیان کرنا کسی مخلوق کے لئے جائز نہیں، قرآن کریم انسان کے لئے جائز نہیں میں ارشاد ہے :-

فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی ۝ (۵۳: ۳۲)

”یعنی تم اپنی پاکی اور صفائی کا دعویٰ نہ کرو، اللہ ہی جانتا ہے کہ کون تقویٰ شعار ہے“

مطلب یہ ہے کہ انسان کی تعریف اور مدح کا مدار تقویٰ پر ہے، اور اس کا حال اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ کس کا تقویٰ کس درجے کا ہے، اور حق تعالیٰ نے جو اپنی حمد و ثناء خود بیان فرمائی، اس کی وجہ یہ ہے کہ بچارہ انسان اس کی استعداد نہیں رکھتا کہ بارگاہِ عزت و جلال کی حمد و ثناء کیسے بیان کریں، اور کسی کی تو کیا مجال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان حمد و ثناء کر سکے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ، یعنی میں آپ کی ثناء کما حقہ نہیں کر سکتا، اس لئے اللہ جل شانہ نے خود ہی حمد و ثناء کا طریقہ انسان کو تعلیم فرمادیا۔

لفظ رب اللہ تعالیٰ کا خاص نام ہے، (۴) لفظ رَبِّ کو ایسے شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی چیز کا مالک غیر اللہ کو رب کہنا جائز نہیں ہو اور اس کی تربیت و اصلاح کی تدبیر اور پوری نگرانی بھی کرتا ہو اور یہ ظاہر ہے کہ ساری کائنات و مخلوقات کا ایسا رب سوائے خدا تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے یہ لفظ اپنے اطلاق کے وقت حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، غیر اللہ کو رب کہنا جائز نہیں، صحیح مسلم کی حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے، کہ کوئی غلام یا نوکر اپنے آقا کو رب کہے، البتہ کسی خاص چیز کی طرف اضافت کر کے انسان وغیرہ کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاسکتا ہے، مثلاً رَبُّ الْمَالِ، رَبُّ الدَّارِ وغیرہ (قرطبی)

استعانت کے معنی کی تشریح | (۵) اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے معنی مفتر القرآن حضرت اور مسئلہ تو مسئلہ کی تحقیق عبد اللہ بن عباسؓ نے یہ بیان فرمائے ہیں کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں، تیرے سوا کسی سے نہیں مانگتے (ابن جریر، ابن ابی حاتم)

بعض سلف صالحین نے فرمایا کہ سورہ فاتحہ پورے قرآن کا راز (خلاصہ) ہے، اور آیت **إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ** پوری سورہ فاتحہ کا راز (خلاصہ) ہے، کیونکہ اس کے پہلے جملے میں شرک سے بری ہونے کا اعلان ہے، اور دوسرے جملے میں اپنی قوت و قدرت سے بری ہونے کا اظہار ہے کہ بندہ عاجز بغیر اللہ تعالیٰ کی مدد کے کچھ نہیں کر سکتا، جس کا نتیجہ اپنے سب کاموں کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے، جس کی ہدایت قرآن کریم میں جا بجا آئی ہے: **فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ** (ہود: ۱۲۳) **قُلْ هُوَ الرَّحْمَنُ أَمَّنَّا بِهِ وَاعْلَمْنَا** (سورہ ملک: ۲۹) **رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا** (مزمل: ۹)

ان تمام آیات کا حاصل یہی ہے کہ مومن اپنے ہر عمل میں اعتماد اور بھروسہ نہ اپنی قابلیت پر کرے نہ کسی دوسرے کی مدد پر بلکہ کلی اعتماد صرف اللہ تعالیٰ ہی پر ہونا چاہئے، وہی کارسازِ مطلق ہے۔ اس سے دو مسئلے اصول عقائد کے ثابت ہوئے، اول یہ کہ:-

اللہ کے سوا کسی کی عبادت رد نہیں | عبادت کے معنی اور پر معلوم ہو چکے ہیں کہ کسی ذات کی انتہائی عظمت و اس کی عبادت میں کسی کو شریک کرنا | محبت کی بناء پر اس کے سامنے اپنی انتہائی عاجزی اور تذلل کا اظہار ہر حرام اور ناقابل معافی حُرم، | اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے، تو یہی شرک کہلاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ شرک صرف اسی کو نہیں کہتے کہ بت پرستوں کی طرح کسی پتھر کی مورتی وغیرہ کو خدائی خستیا رات کا مالک سمجھے، بلکہ کسی کی عظمت، محبت، اطاعت کو وہ درجہ دینا جو اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے یہ بھی شرک جلی میں داخل ہے، وقرآن مجید میں یہود و نصاریٰ کے شرک کا بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

إِتَّخَذُوا أَحْبَابَهُمْ دُورًا مُّحَمَّدٌ
أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ (۳۱: ۹)

”یعنی ان لوگوں نے اپنے دینی عالموں کو اپنا رب بنالیا ہے“

حضرت عدی بن حاتم رجو مسلمان ہونے سے پہلے نصرانی تھے انھوں نے اس آیت کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم تو کچھ اپنے علماء کی عبادت نہیں کرتے تھے، پھر قرآن میں ان کو مجبور بنانے کا الزام ہم پر کیسے لگایا گیا، آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہے کہ تمھارے علماء بہت سی ایسی چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں جن کو اللہ نے حلال کیا ہے، اور تم اپنے علماء کے کہنے پر ان کو حرام ہی سمجھتے ہو، اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے تمھارے علماء ان کو حلال کر دیتے ہیں، تو تم ان کے کہنے کا اتباع کر کے حلال کر لیتے ہو، عدی بن حاتم نے عرض کیا کہ بیشک ایسا تو ہے، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی تو ان کی عبادت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے حلال یا حرام قرار دینے کا حق صرف حق تعالیٰ کا ہے، جو شخص اس

میں کسی دوسرے کو شریک قرار دے اور اللہ تعالیٰ کے احکام حرام و حلال معلوم ہونے کے باوجود ان کے خلاف کسی دوسرے کے قول کو واجب الاتباع سمجھے وہ گویا اس کی عبادت کرتا ہے، اور شرک میں مبتلا ہے۔

عام مسلمان جو قرآن و سنت کو براہ راست سمجھنے کی اور ان سے احکام شرعیہ نکالنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس لئے کسی امام، مجتہد، یا عالم و مفتی کے قول پر اعتماد کر کے عمل کرتے ہیں اُس کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ وہ درحقیقت قرآن و سنت ہی پر عمل ہے اور احکام خداوندی ہی کی اطاعت ہے، اور خود قرآن کریم نے اس کی ہدایت فرمائی ہے:

فَسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ (۱۶: ۴۳)

”یعنی اگر تم خود احکام الہیہ کو نہیں جانتے، تو اہل علم سے پوچھ لو“

اور جس طرح احکام حلال و حرام میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو شریک کرنا شرک ہے اسی طرح کسی کے نام کی نذر (منت) ماننا بھی شرک میں داخل ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو حاجت روا مشکل کشا سمجھ کر اُس سے دعا مانگنا بھی شرک ہے، کیونکہ حدیث میں دعا کو عبادت فرمایا گیا ہے۔ اسی طرح ایسے اعمال و افعال جو علامات شرک کی سمجھے جاتے ہیں ان کا ارتکاب بھی حکم شرک ہے، جیسے حضرت عدی بن حاتمؓ نے فرمایا کہ (مسلمان ہونے کے بعد) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے گلے میں صلیب پڑی ہوئی تھی، آپ نے مجھ سے فرمایا کہ اس بُت کو اپنے گلے سے نکال دو۔ اگرچہ اُس وقت عدی بن حاتمؓ کا عقیدہ صلیب کے متعلق وہ نہ تھا جو نصرانیوں کا ہوتا ہے، مگر ظاہری طور پر بھی علامت شرک سے چسبنا کو ضروری سمجھ کر یہ ہدایت کی گئی، افسوس کہ آج کل ہزاروں مسلمان ریڈ کر اس کا صلیبی نشان لگائے ہوئے پھرتے ہیں، اور کوئی پروا نہیں کرتے، کہ بلاوجہ ایک مشرک کا نہ جرم کے مرتکب ہوئے ہیں، اسی طرح کسی کو رکوع، سجدہ کرنا، یا بیت اللہ کے سوا کسی دوسری چیز کے گرد طواف کرنا، یہ سب علامات شرک ہیں جن سے اجتناب اِيَّاكَ تَعْبُدُ کے اقرار یا حلف و فادائی کا جز ہے، دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ استعانت اور استغاثہ صرف اللہ تعالیٰ ہی سے کرنا ہے کسی دوسرے سے جائز نہیں۔ مسئلہ استعانت و توسل کی تحقیق | یہ دوسرا مسئلہ کسی سے مدد مانگنے کا ذرا تشریح طلب ہے، کیونکہ ایک مدد اور احکام کی تفصیل | تو مادی اسباب کے ماتحت ہر انسان دوسرے انسان سے لیتا ہے،

اس کے بغیر اس دنیا کا نظام چل ہی نہیں سکتا، صنعت کار اپنی صنعت کے ذریعہ ساری مخلوق کی خدمت کرتا ہے، مزدور، معمار، بڑھئی، لوہار سب مخلوق کی مدد میں لگے ہوئے ہیں، اور ہر شخص ان سے مدد لینے مانگنے پر مجبور ہے، ظاہر ہے کہ یہ کسی دین اور شریعت میں ممنوع نہیں، وہ اُس استعانت میں داخل نہیں، جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، اسی طرح غیر مادی اسباب کے ذریعہ کسی نبی یا ولی سے دعا کرنے

کی مدد مانگنا یا ان کا وسیلہ نہ کر براہ راست اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا روایات حدیث اور اشارات قرآن سے اس کا بھی جواز ثابت ہے، وہ بھی اُس استعانت میں داخل نہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص اور غیر اللہ کے لئے حرام و شرک ہے۔

اب وہ مخصوص استعانت و امداد جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خالص اور غیر اللہ کے لئے شرک ہو کونسی ہے اس کی دو قسمیں ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی فرشتے یا پیغمبر یا ولی یا کسی اور انسان کو خدا تعالیٰ کی طرح قادر مطلق اور مختار مطلق سمجھ کر اس سے اپنی حاجت مانگے، یہ تو ایسا کھلا ہوا کفر ہے کہ عام مشرکین بت پرست بھی اس کو کفر سمجھتے ہیں، اپنے بتوں، دیوتاؤں کو بالکل خدا تعالیٰ کی مثل قادر مطلق اور مختار مطلق یہ کفار بھی نہیں مانتے۔

دوسری قسم وہ ہے جس کو کفار اختیار کرتے ہیں، اور قرآن اور اسلام اس کو باطل و شرک قرار دیتا ہے، اِنَّكَ تَسْتَعِينُ میں یہی مراد ہے، کہ ایسی استعانت و امداد ہم اللہ کے سوا کسی سے نہیں چاہتے، وہ یہ ہے کہ اللہ کی کسی مخلوق فرشتے یا پیغمبر یا ولی یا کسی دیوتا کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ اگرچہ قادر مطلق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور کامل اختیارات اسی کے ہیں، لیکن اس نے اپنی قدرت و اختیار کا کچھ حصہ فلاں شخص کو سونپ دیا ہے، اور اُس دائرے میں وہ خود مختار ہو یہی وہ استعانت و استمداد ہے جو مومن و کافر میں فرق اور اسلام و کفر میں امتیاز کرتی ہے، قرآن اس کو شرک و حرام قرار دیتا ہے، بت پرست مشرکین اس کے قائل اور اس پر عامل ہیں۔

اس معاملے میں دھوکہ یہاں سے لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بہت سے فرشتوں کے ہاتھوں دنیوی نظام کے بہت سے کام جاری کرتے ہیں، دیکھنے والا اس مغالطے میں پڑ سکتا ہے کہ اس فرشتے کو اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار سپرد کر دیا ہے، یا انبیاء علیہم السلام کے ذریعے بہت سے ایسے کام وجود میں آتے ہیں جو عام انسانوں کی قدرت سے خارج ہیں، جن کو معجزات کہا جاتا ہے، اسی طرح اولیاء اللہ کے ذریعے بھی ایسے ہی بہت سے کام وجود میں آتے ہیں، جن کو کرامات کہا جاتا ہے، یہاں سرسری نظر والوں کو یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کاموں کی قدرت و اختیار ان کو سپرد نہ کرتا تو ان کے ہاتھ سے یہ کیسے وجود میں آتے؟ اس سے وہ ان انبیاء و اولیاء کے ایک درجے میں فخر کار ہونے کا عقیدہ بنا لیتے ہیں حالانکہ حقیقت یوں نہیں، بلکہ معجزات اور کرامات براہ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، صرف اس کا ظہور پیغمبر یا ولی کے ہاتھوں پر ان کی عظمت ثابت کرنے کے لئے کیا جاتا ہے، پیغمبر اور ولی کو اس کے وجود میں لانے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا، قرآن مجید کی بے شمار آیات اس پر شاہد ہیں، مثلاً آیت وَمَا مِثَّتْ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَءٰی (۸: ۱۷) میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزے کا ذکر ہے جس میں آپ نے دشمن کے لشکر کی طرف ایک مٹھی کنکریوں کی پھینکی، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے

وہ سارے لشکر کی آنکھوں میں جا لگیں اس کے متعلق ارشاد ہے کہ یہ آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی، جس سے معلوم ہوا کہ معجزہ جو نبیؐ کے واسطے صادر ہوتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کو جب اُن کی قوم نے کہا کہ اگر آپ سچے ہیں تو جس عذاب ڈرا ہے میں وہ بُلا لیجئے، تو انھوں نے فرمایا: - اِنَّمَا يَأْتِيكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَاءَ (ہود: ۳۳) ”یعنی معجزہ کے طور پر آسمانی عذاب نازل کرنا میرے قبضے میں نہیں، اللہ تعالیٰ اگر چاہے گا تو یہ عذاب آجائے گا پھر تم اس سے بھاگ نہ سکو گے۔“

سورة ابراہیم میں انبیاء و رسل کی ایک جماعت کا یہ قول ذکر فرمایا ہے مَا كَانَ لَنَا اَنْ نَّاتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۱۱: ۱۳) یعنی کسی معجزہ کا صادر کرنا ہمارے ہاتھ میں نہیں، اللہ تعالیٰ کے اذن و مشیت کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا، اسی وجہ سے کوئی پیغمبر یا کوئی ولی جب چاہے جو چاہے معجزہ یا کرامات دکھائے یہ قطعاً کسی کے بس میں نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسری انبیاء سے بہت سے معین معجزات کا مطالبہ مشرکین نے کیا، مگر جس کو اللہ تعالیٰ نے چاہا ظاہر کر دیا جس کو نہ چاہا نہیں ہوا، پورا قرآن اس کی شہادتوں سے بھرا ہوا ہے۔

ایک محسوس مثال سے اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ آپ جس کمرے میں بیٹھے ہیں اس میں بجلی کی روشنی بلب سے اور ہوا برقی پنکھے سے آپ کو پہنچ رہی ہے، مگر یہ بلب اور پنکھا اس روشنی اور ہوا پہنچانے میں قطعاً خود مختار نہیں، بلکہ ہر آن اس جوڑ (کنکشن) کے محتاج ہیں جو تار کے ذریعے پاور ہاؤس کے ساتھ اُن کو حاصل ہے، ایک سیکنڈ کے لئے یہ جوڑ ٹوٹ جائے، تو نہ بلب آپ کو روشنی دے سکتا ہے نہ پنکھا ہوا دے سکتا ہے، کیونکہ درحقیقت وہ عمل بلب اور پنکھے کا ہے ہی نہیں، بلکہ بجلی کی رد و کا ہے، جو پاور ہاؤس سے یہاں پہنچ رہی ہے، انبیاء و اولیاء اور سب فرشتے ہر عمل میں ہر کام میں ہر آن حق تعالیٰ کے محتاج ہیں، اسی کی قدرت و مشیت سے سب کام وجود میں آتے ہیں، اگرچہ ظہور اس کا بلب اور پنکھے کی طرح انبیاء و اولیاء کے ہاتھوں پر ہوتا ہے۔

اس مثال سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ان چیزوں کے صدور اور وجود میں اگرچہ اختیار انبیاء و اولیاء کا نہیں مگر اُن کا وجود باوجود اُن سے بالکل بے دخل بھی نہیں، جیسے بلب اور پنکھے کے بغیر آپ کو روشنی اور ہوا نہیں پہنچ سکتی یہ معجزات و کرامات بھی انبیاء و اولیاء کے بغیر نہیں ملتے، اگرچہ یہ فرق ضرور ہے کہ پوری فٹنگ اور کنکشن درست ہونے کے باوجود آپ کو بغیر بلب کے روشنی اور بغیر پنکھے کے ہوا کا ملنا عادتہ ناممکن ہے، اور معجزات و کرامات میں حق تعالیٰ کو سب کچھ قدرت ہے، کہ بغیر واسطہ کسی پیغمبر و ولی کے بھی اس کا ظہور فرمادیں، مگر عادتہ اللہ یہی ہے کہ اُن کا صدور بغیر واسطہ اولیاء و انبیاء کے

نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے خوارق عادات کے اظہار سے جو مقصد ہر وہ اس کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔
اس لئے معلوم ہوا کہ عقیدہ تو یہی رکھنا ہے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت سے ہو رہا ہے
اس کے ساتھ انبیاء و اولیاء کی عظمت و ضرورت کا بھی اعتراف ضروری ہے، اس کے بغیر رضائے
الہی اور طاعت احکام خداوندی سے محروم رہیگا، جس طرح کوئی شخص بلب اور پنکھے کی قدر نہ پہچانے
اور ان کو ضائع کرنے تو روشنی اور ہوائے محروم رہتا ہے۔

وسیلہ، استعانت اور استمداد کے مسئلے میں بکثرت لوگوں کو اشکال رہتا ہے، امید ہے کہ اس
تشریح سے اصل حقیقت واضح ہو جائے گی، اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ نبیاء و اولیاء کو وسیلہ بنانا
نہ مطلقاً جائز ہے اور نہ مطلقاً ناجائز، بلکہ اس میں وہ تفصیل ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے کہ کسی کو مختار مطلق
سمجھ کر وسیلہ بنایا جائے تو شرک و حرام ہے، اور محض واسطہ اور ذریعہ سمجھ کر کیا جائے تو جائز ہے، اس
میں عام طور پر لوگوں میں افراط و تفریط کا عمل نظر آتا ہے۔

واللہ اسأل الصواب والستد دو بیہ المبدأ والمعاد

صراطِ مستقیم کی ہدایت دنیاوی (۶) اصل تفسیر میں یہ بات وضاحت سے آگئی ہے کہ قرآن کریم نے جس
دین میں کلید کامیابی ہے دعا کو ہر شخص کے لئے ہر کام کے لئے ہر حال میں انتخاب فرمایا ہے
وہ صراطِ مستقیم کی ہدایت کی دعا ہے، جس طرح آخرت کی کامیابی اُس صراطِ مستقیم پر موقوف ہے جو انسان کو
جنت کی طرف لیجائے اسی طرح دنیا کے سائے کاموں میں بھی غور کر دو تو کامیابی کا مدار صراطِ مستقیم ہی ہے،
جس کام میں وہ آلات و ذرائع اختیار کئے گئے، جس کے نتیجے میں مقصد کا حصول عادتاً لازمی ہے تو کامیابی
عادتاً لازمی ہوتی ہے، چہاں کہیں انسان اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا تو اگر وہ غور کرے تو معلوم
ہو جائے گا کہ کام کے کسی مرحلے میں اس نے غلطی کی ہے، صحیح راستہ ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا، اس لئے
نا کامیابی ہوئی۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت صرف آخرت اور دین کے کاموں کے ساتھ مخصوص
نہیں، دنیا کے سب کاموں کی درستی اور کامیابی بھی اسی پر موقوف ہے، اس لئے یہ دعا ایسی ہے کہ مومن
کو ہر وقت حرزِ جان بنانے کے قابل ہے، شرط یہ ہے کہ استحضار اور نیت کے ساتھ کی جائے، محض الفاظ
کا پڑھ لینا نہ ہو، واللہ الموفق والمعين۔

بعونہ تعالیٰ تفسیر سورۃ فاتحہ ختم ہوئی،

واللہ الحمد والہ وآخِرہ وظاہرہ وباطنہ

بنج بنج بنج